

یادگارِ غالب

(حصہ فارسی)

مکتبہ جانی دہلی
مکتبہ جامعہ ملیہ

اشتراک

پروفیسر کی نسلِ بیکار و فروغِ ادب و زبانِ اہل

یادگارِ غالب

یادگارِ غالب

(حصہ قاری)

خواجہ الطاف حسین حالی

مکتبہ جامعہ ملیہ
دہلی

اشتراک

پتہ: ۱۱، سٹریٹ نمبر ۱۱، فوٹو گرافک سٹریٹ، لاہور

Yadgar-e-Ghalib
by
Khwaja Altaf Husain Hali
Rs.112/-



صدر دفتر

011-26987295 ☎

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

011-23260668 ☎

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔ 110006

022-23774857 ☎

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔ 400003

0571-2706142 ☎

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ 202002

011-26987295 ☎

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

قیمت :- 112 روپے

تعداد: 1100

سنہ اشاعت: 2011

سلسلہ مطبوعات: 1564

ISBN: 978-81-7587-681-1

ناشر: ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوٹنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099

ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسل امیجنگ سسٹمز آفسیٹ پرنٹرز، C-7/5 لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔ 110035

اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

معروضات

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، نامساعد حالات سے بھی سابقہ پڑا مگر سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کئی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنفین کی سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلباء کے لیے ”درسی کتب“ اور ”معیاری سیریز“ کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کیا اب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دلی، ممبئی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور مکتبہ کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعال ڈائریکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عملی اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آئندہ بھی شامل حال رہے گا۔

خالد محمود

نیجنگ ڈائریکٹر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

فهرست مضامین

۲۴۹	بنداول	۲۲۵	نظم و نثر فارسی
۲۵۲	از بند سوم	۲۳۴	انتخاب غزلیات فارسی
۲۵۲	از بند چهارم	۳۱۹	رباعیات
۲۵۴	قطعات		قصائد
۲۵۶	بنداول	۳۳۰	توحید
۲۵۸	بند دوم	۳۳۲	مرثیه و نوحه
۲۵۹	بند سوم	۳۳۳	قصیده ضربیه - ستایش روزگار
۲۶۱	بند چهارم	۳۳۶	صفت سالکان طریقت
	قطعات فارسی	۳۳۸	صفت موسم بهار
۳۶۲	بند پنجم	۳۴۱	کیفیت آغاز موسم سرما
۳۶۳	بند ششم	۳۴۶	صفت موسم بهار
۳۶۴	بند هفتم	۳۴۸	کیفیت صبح

۴۰۱	از دیباچہ دیوانِ فارسی	۳۷۵	نشر فارسی
۴۰۲	از خاتمہ دیوانِ فارسی	۳۷۸	نشر فارسی کے نمونے
۴۰۴	از دیباچہ دیوانِ تفتہ	۳۸۲	فخریہ فقرے
		۳۸۴	طرزِ واقعہ نگاری
۴۰۵	انتخاب از مکاتبات	۳۸۷	پارہ از احوال امیر تیمور
	شیخ علی حزیں اور مرزا کے	۳۹۱	پارہ از احوال ہمایوں و شیر شاہ
۴۴۰	طرز بیان کا مقابلہ	۳۹۲	از دستنبوہ - غدر کے اسباب
	مرزا اور ابوالفضل کی طرز بیان	۳۹۴	کیفیت شورش باغیان در دہلی
۴۴۲	کا مقابلہ	۳۹۶	از دیباچہ ثانی در فہرست کادریانی
۴۴۶	خاتمہ	۳۹۹	از تقریظات دیباچہ اے

نظم و شرفاری

فارسی لٹریچر میں ایشیائی مذاق کے موافق جو دستگاہ مرزا نے بہم پہنچائی تھی اور فارسی نظم اور فارسی نثر دونوں میں جو بلند پایہ انھوں نے حاصل کیا تھا، اُس کو اس زمانے میں کما حقہ لوگوں کے ذہن نشین کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے، جب کہ اس زمانے میں بہت سخیں اور نکمے پرور موجود تھے، مرزا ہمیشہ زمانے کی ناقدری کی شکایت کرتے تھے، تو اب کیا امید ہو سکتی ہے کہ لوگوں کو ان کی قدر بتائی جاسکے۔ ہم سے اگر کچھ ہو سکتا ہے، تو صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ ان کے ہر قسم کے کلام میں سے کچھ کچھ بطور نمونہ کے پبلک کے سامنے پیش کر دیں، اور چوں کہ فارسی زبان سے ملک میں عموماً اجنبیت ہو گئی ہے، اس لیے جہاں ضرورت دیکھیں مرزا کے کلام کی شرح بھی کرتے جائیں۔ اس سے شاید یہ فائدہ ہو کہ مرزا کی قوتِ متخیلہ میں جو غیر معمولی آپک اور پرواز قدرت نے ودیعت کی تھی، سمجھ دار آدمی اس کا کسی قدر اندازہ کر سکیں، لیکن زبان اور بیان کی خوبی جو ایک وجدانی چیز ہے اور جس کے نقاد اور جوہری ملک میں کیا اب بلکہ نایاب ہیں۔ اس کی نسبت صرف مرزا کا یہ فصیح و بلیغ شعر لکھ دینا کافی معلوم ہوتا ہے:

بیاورید، گراہنجا بود زبان دانے غریب شہر سخن ہاے گفتنی وارد
البتہ ایک مختصر گز مرزا کے متعلق یہاں بتادینا ضرور ہے، جو ان کا کلام دیکھتے وقت یاد رکھنا چاہیے۔ اگرچہ مرزا کو فارسی زبان میں (خواہ نظم ہو،

خواہ نثر) ہر قسم کے مضامین بیان کرنے پر ایسی ہی قدرت حاصل تھی، جیسی کہ ایران کے ایک بڑے سے بڑے مشاق و ماہر و مسلم البتوت استاد کو ہونی چاہیے، لیکن جس طرح تمام ممتاز اور نامور شعراء میں خاص خاص مضامین کے ساتھ زیادہ مناسبت دیکھی گئی ہے، اسی طرح مرزا بھی اس کلمے سے مستثنیٰ نہ تھے۔ تصوف، حبِ اہلبیت، فخر، شوخی و ظرافت، رندی و بے باکی، بیانِ رنج و مصیبت و شکایت و زارنالی، اظہارِ محبت و ہمدردی، حسنِ طلب — یہ چند میدان ایسے تھے، جن کا بیان مرزا کے تمام اصنافِ سخن میں اکثر نہایت لطیف و دلچ و مرقص واقع ہوا ہے۔ بے شک یہ بات ان کے عشقیہ مضامین و اخلاق و موعظت کے بیان میں عام طور پر نہیں پائی جاتی کیوں کہ عشق و محبت اور تمام تعلقات و معاملات عاشق و معشوق کا بیان، جیسا کہ ظاہر ہے، محض پنچرل سادگی اور بے تکلفی چاہتا ہے اور شاعرانہ صنعت سے جس کو مرزا نے جا بجا شاعری کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، ابا کرتا ہے۔ برغلاف اس کے مرزا اصنافِ کلام میں اپنی مصطلح شاعری کا سرشتہ ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے (الا ماشاء اللہ)، اسی لیے ان کے عاشقانِ اشعار میں باوجود کمالِ جزالت اور متانت کے وہ گرمی اور تاثیر جو شعر کی جان اور غزل کا ایمان ہے، عام طور پر نہیں پائی جاتی۔ اخلاق و موعظت کا بیان بھی اسی لیے موثر اور دل آویز نہیں ہے کہ وہ جب تک نہایت سادہ اور صاف اور شاعرانہ تکلفات سے پاک نہ ہو، دلوں میں گھر نہیں کر سکتا، مگر اس سے مرزا کی استادی میں کچھ فرق نہیں آتا۔ جب سعدی کی رزم کی نسبت کہا جاتا تھا کہ ”اے شیوہ ختم است بر دیگران“ اور اس کا قصیدہ بھی بہت پست سمجھا جاتا تھا اور بایں ہمہ سعدی کی استادی کو سب نے تسلیم کیا، تو مرزا کے خاص قسم کے بیانات کی نسبت یہ کہنے سے ان کی استادی میں کیوں کر فرق آسکتا ہے! یہ میزان جو ہم نے

مرزا کے کلام کی نسبت بتائی ہے، اس کو ان کے کلیاتِ نظم و نثر میں جانچنا چاہیے، نہ انتخابی اشعار میں، جو اس کتاب میں درج کیے گئے ہیں۔

مرزا کی فارسی شاعری اور فارسی انشا پر داری کے متعلق یہ بات قابلِ غور ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے پچاس برس تک مرزا کو ایک ایسے فن کی تکمیل اور اس میں ترقی کرنے پر مستعد و سرگرم رکھا، جس کا زمانے میں کوئی قدر دان نہ تھا۔ ان کے ممدوح زیادہ تر انگلش گورنمنٹ کے ارکان و اعیان تھے جو فارسی زبان اور فارسی شاعری سے محض اجنبی تھے، یا بادشاہ اور سلاطین و امرا و رؤسا تھے، جن کو مرزا کے فارسی قصیدے پڑھنے اور سمجھنے کی نہ فرصت تھی، نہ ضرورت۔ وہ شخص جس کا قصیدہ انوری و ماقانی کے قصیدوں سے بیکتر کھائے، جس کی غزل عرفی و طالب کی غزل سے سبقت لے جائے، جو رباعی میں عمر خیام کی آواز میں آواز ملائے اور جس کی نثر کے آگے ابوالفضل اور ظہوری کی نثریں پھسکی اور بے مزہ معلوم ہوں، اس کو بہادر شاہ کی سرکار سے صرف پچاس روپیہ ماہوار ملتا تھا، اور وہ بھی چھ سات برس سے زیادہ نہیں ملا۔ گورنمنٹ کے ارکان و اعیان کی مدح کے جلد و میں مرزا کو اس فطرت کے سوا کبھی کچھ نہیں مرحمت ہوا، جو فوراً فروخت ہو کر سرکاری چپراسیوں کے انعام میں صرف ہو جاتا تھا۔

مرزا کے ماننے والے اور ان کے فارسی کلام پر ایمان بالغیب رکھنے والے بلاشبہ ملک میں بے شمار تھے، مگر ایسے خوش اعتمادوں کی کثرت اور ان کی تحسین و آفرین سے شاعر کا دل ہرگز نہیں بڑھ سکتا۔ پس جب کہ ممدوحوں کی قدر دانی کا وہ حال ہو، اور مادہ بین کی مدح سرائی کا یہ رنگ، تو پھر وہ کیا چیز تھی جس کو مرزا کی اصلی اور حقیقی ترقی کا باعث قرار دیا جائے۔ بات یہ ہے کہ شاعر کے دل میں اصلی ترقی کا ولولہ، نہ سلاطین و امرا کی داد و دہش سے پیدا ہو سکتا ہے اور نہ

خوش اعتقاد شاگردوں اور ماننے والوں کی کثرت سے؛ بلکہ اس کا دل بڑھانے والی صرف دو چیزیں ہیں، جو خواہی نخواہی اس کو ترقی کرنے پر مجبور کرتی ہیں؛ اولاً سبق استعداد اور فطری قابلیت جس کا اقتضایہ ہے کہ اگر تمام عالم میں ایک قدردان یا مخاطب صحیح نہ ہو، تو بھی وہ اپنے جوہر ظاہر کے بغیر نہیں رہتی جس طرح مورخوہ ویرانے میں ہوا اور خواہ آبادی میں، اس کو مستی اور نشاط کے عالم میں ناچنے سے گریز نہیں، اسی طرح وہ شاعر، جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہی پیدا ہوا ہے، بغیر اس کے کہ ملک میں کوئی اس کی قدر کرے، یا اس کے کمال کی داد دے، اپنے ہنر کی تکمیل میں ہاتھ پاؤں مایہ بغیر نہیں رہ سکتا۔ دوسرے، اُس فطری ملکہ کا تحریک دینے والا اور اس آگ کا پتھر سے نکالنے والا اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ سوسائٹی میں کچھ لوگ فی الحقیقت سخن فہم و سخن سنج موجود ہیں۔

اگرچہ ہندوستان میں فارسی زبان کا چراغ مدت سے ٹٹھار رہا تھا اور فارسی شاعری کی عمر طبعی اختتام کے قریب پہنچ گئی تھی، مگر حسن اتفاق سے اس خیرود میں چند صاحبان فضل و کمال خاص دار الخلافہ دہلی میں ایسے پیدا ہو گئے تھے جو علم و فضل کے علاوہ شعرو سخن کا مذاق بھی اعلیٰ درجے کا رکھتے تھے۔ ان چند صاحبوں سے میری مراد مولانا فضل حق خیر آبادی ثم الہلوی، مولانا مفتی محمد صدر الدین خان متخلص بہ آزرہ، مولوی عبداللہ خان علوی، مولوی امام بخش مہبائی، حکیم مومن خان مومن، نواب مصطفیٰ خان حسرتی، نواب ضیاء الدین احمد خان نیر، سید غلام علی خان وحشت وغیرہم ہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کا مرزا کے عصر میں موجود ہونا ان کی شاعری کے حق میں بعینہ ایسا تھا، جیسا عرفی و نظیری کے حق میں غانخان، ابوالفتح، فیضی اور ابوالفضل کا ان کے زمانے میں ہونا۔

اگرچہ ان بزرگواروں میں بعض اصحاب ایسے بھی تھے جو ظاہر مرزا کی شاعری

کو تسلیم نہیں کرتے تھے، لیکن چوں کہ یہ سب لوگ سخن فہم اور سخن سنج تھے، اس لیے جس طرح قدر دانوں کی تحسین و آفرین سے مرزا کا دل بڑھتا تھا، اسی طرح نکرہ چینوں کے خیال سے ان کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا، اور ان کے دل پر اپنا نقش بٹھانے کے لیے اظہارِ کمال میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی، اور اس طرح قدر دان اور نکتہ چین دونوں ان کی ترقی کا باعث تھے۔

مولانا فضل حق باایں ہر علم و فضل مرزا کو جس رتبے کا شاعر مانتے تھے، لطیفہ اس کا اندازہ حکایتِ ذیل سے ہو سکتا ہے:

مولانا کے شاگردوں میں سے ایک شخص نے ناصر علی سرمنہدی کے کسی شعر کے معنی مرزا صاحب سے جا کر پوچھے۔ انھوں نے کچھ معنی بیان کیے۔ اُس نے وہاں سے آکر مولانا سے کہا: ”آپ مرزا صاحب کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی اس قدر تعریف کیا کرتے ہیں، آج انھوں نے ایک شعر کے معنی بالکل غلط بیان کیے“ اور پھر وہ شعر پڑھا اور جو کچھ مرزا نے اُس کے معنی کہے تھے، بیان کیے۔ مولانا نے فرمایا: ”پھر ان معنوں میں کیا برائی ہے؟“ اس نے کہا: ”برائی تو کچھ ہو یا نہ ہو، مگر ناصر علی کا یہ مقصود نہیں ہے“ مولانا نے کہا: ”اگر ناصر علی نے وہ معنی مراد نہیں لیے جو مرزا نے سمجھے ہیں، تو اس نے سخت غلطی کی۔“

مرزا نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں کم از کم شیخ علی حزیں کا مثل قرار دیا ہے، اور وہ مقطع یہ ہے:

تو بدیں شیوہ گفتار کہ داری، غالب! گر ترقی نہ کنم، شیخ علی رامانی
مومن خان مرحوم نے جس وقت یہ مقطع سنا، اپنے دوستوں سے کہنے لگے کہ اس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے، مرزا کو ہم کسی طرح علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے۔
لطیفہ ایک صاحب نے جو مومن خان مرحوم کی تعلیموں سے خوب واقف تھے

یہ حکایت سن کر کہا کہ مومن خان نے یہ اس لیے کہا کہ وہ اپنا تہہ یقیناً شیخ علی حزیں سے برتر و بلند تر سمجھتے تھے اور نہ وہ ہرگز مرزا کو شیخ کے برابر تسلیم نہ کرتے۔ نواب مصطفیٰ خان مرحوم ہمیشہ مرزا کو ظہوری و عرفی کا ہم پایہ کہا کرتے تھے اور صائب و کلیم وغیرہ سے ان کو برتر و بالا سمجھتے تھے۔ نواب ضیاء الدین خان کا مرزا کی نسبت یہ قول تھا کہ ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترک لاپہین (یعنی امیر خسرو) سے ہوئی اور ایک ترک ابیک (یعنی مرزا غالب) پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ سید غلام علی خان وحشت مرزا کی نسبت کہتے تھے کہ اگر یہ شخص عربیہ کی طرف متوجہ ہو جاتا تو بڑی شہر میں دوسرا متبسی یا ابوتام ہوتا اور اگر انگریزی زبان کی تکمیل کرتا تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا۔

مولانا آزاد وہ بے شک مرزا کی طرز خاص کو جو انھوں نے ابتدا میں اختیار کی تھی، ناپسند کرتے تھے؛ اور جو خیال کہ ابتدا میں مرزا کی نسبت مولانا کے خاطر نشین ہو گیا تھا، وہ اخیر تک ان کے دل میں کسی نہ کسی قدر باقی رہا۔ چنانچہ مرزا نے جو ایک فارسی قصیدہ مولانا ممدوح کی شان میں لکھا ہے، اس میں اس مضمون کی طرف نہایت لطیف اشارہ کیا ہے کہ مولانا ان کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ قصیدے کی تمہید میں اپنے مصائب و آلام و شکایت روزگار وغیرہ کا بیان ہے، اس کے بعد مدح کی طرف اس طرح گریز کرتے ہیں:

خواجہ گرانہ گسارِ من نبوے، ولے من!
 مستغرقِ دیدہ رے بو علی بارے من
 بزرگوار و عقلِ فعا شکرِ م فرماے من
 آنکہ ننگِ دست بودان درخمن، ہمتاے من

باچنیں اندہ کہ پر گفتم و دل خالی نشد
 آنکہ در یکتائی و سے در فن فرزانگی
 آنکہ چوں خواہد نباش نامہ نامی ستان
 دل بدیں و صغم نیاساید سخن کو تہ کنید

یعنی بوعلی سینا کا ممدوح کی یکتائی پر میرے ساتھ اتفاق رائے کرنا اور عقلِ فعال کا اس کو "کر مغز مائے من" لکھنا یہ سب باتیں اس کی مدح کے لیے کافی نہیں ہیں؛ مختصر یہ کہ وہ ایسا شخص ہے کہ شعریں مجھ جیسے شخص کا ہمسرو ہوتا ہوتا بھی اس کے واسطے موجبِ تنگ و عار ہے۔ اس میں قطع نظر اس کے کہ ممدوح کی اور اس سے بھی زیادہ اپنی تعریف، ایک نہایت لطیف پیرایے میں بیان کی ہے، اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ ممدوح میری شاعری کو پسند نہیں کرتا۔

مرزا کی وفات سے چھ سات برس پہلے کا ذکر ہے کہ ایک روز نواب حسرتی کے مکان پر حجب کر راقم بھی موجود تھا، آزدہ اور غالب اور بعض اور مہمان جمع تھے۔ کھانے میں دیر تھی، فارسی دیوانِ غالب کے کچھ اوراق پڑے ہوئے مرزا کی نظر پڑ گئے۔ ان میں ایک غزل تھی، جس کے مقطع میں اپنے منکروں کی طرف خطا کیا تھا اور جس کا مطلع یہ ہے:

نشاطِ معنویاں از شرابخانہ تست فسونِ بابلیاں فصلے ارفسانہ تست

مرزا نے وہ اوراق اٹھالیے اور مولانا آزدہ سے مزاح کے طور پر کہا: دیکھیے کسی ایرانی شاعر نے کیا زبردست غزل کہی ہے! یہ کہ کر غزل پڑھنی شروع کی۔ اول کے دو تین شعروں کی مولانا نے تعریف کی، مگر پھر بعض قرائن سے سمجھ گئے کہ مرزا ہی کا کلام ہے۔ مسکرا کر، جیسی ان کی عادت تھی، کہنے لگے: "کلام مربوط ہے، مگر نوآموز کا کلام معلوم ہوتا ہے! سب حاضرین ہنس پڑے۔ جب مقطع کی نوبت آئی، مرزا نے مولانا کی طرف خطاب کر کے دردناک آواز سے یہ مقطع پڑھا:

تو ایک محوِ سخن گسترانِ پیشینی مباحثِ منکر غالب کہ در نانہ تست

اس وقت سب لوگ بہت متاثر ہوئے اور مولانا آزدہ شرمناک خاموش ہو رہے۔

صہبائی اور علوی بھی چوں کہ مرزا بیدل کا تتبع کرتے تھے اور مرزا غالب

نے اس طریقے کو بالکل چھوڑ دیا تھا، اس لیے وہ مرزا کو اور مرزا ان کو کم ہاتھ تھے۔ لیکن چوں کہ یہ تمام گروہ سخن فہموں اور سخن سنجوں کا تھا اور مشاعروں میں اکثر ایک دوسرے سے مدبھیر رہتی تھی، مرزا کو اپنے خیالات کی اصلاح اور اپنے اشعار کی تہذیب و تنقیح میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی؛ اور یہی ان کی اصلی ترقی کی بنیاد تھی۔

غزل

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے فارسی غزل بھی اول مرزا بیدل وغیرہ کی طرز میں کہنی شروع کی تھی۔ چنانچہ اس قسم کی بہت سی غزلیں ان کے دیوان میں اب تک موجود ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ طرز بدلتی گئی اور آخر کار عرفی، ظہوری، نظیری اور طالب آملی وغیرہ کی غزل کا رنگ مرزا کی غزل میں پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے دیوان فارسی کے قاصد میں لکھتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے :

اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جو یا تھی، لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ تران لوگوں کی پیروی کرتا رہا، جو راہ صواب سے نابلد تھے۔ آخر جب ان لوگوں نے جو اس راہ میں پیش رو تھے، دیکھا کہ میں باوجود دے کہ ان کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بے راہ بھٹکتا ہوں، ان کو میرے حال پر رحم آیا اور انھوں نے مجھ پر ”مرتبیانہ“ نگاہ ڈالی۔ شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتائی؛ طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا، اس کو فنا کر دیا؛ ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اند میری کمر پر زارِ راہ باندھا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا مجھ کو سکھایا۔ اب اس گروہ والا شکوہ کے نصیحت تربیت سے میرا کلب رقاص بچاں میں کباب ہے تو راگ میں موسیقار؛ جلوے میں طاؤس

ہے تو پرواز میں عنقا۔

مرزا کے اس بیان سے پایا جاتا ہے کہ وہ غزل میں خاص نظیری کی روش پر چلتے تھے، مگر ان کی غزلیات کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی غزل میں نہ صرف نظیری، بلکہ عرفی، ظہوری، طالب آملی، جلال اسیر اور ان کے دیگر متبعین کی غزل کا رنگ علی العموم پایا جاتا ہے۔ البتہ اس لحاظ سے کہ تصوف کا عنصر مرزا کے کلام میں نظیری سے کچھ کم نہیں ہے، ان کی غزل بلاشبہ نظیری کی غزل سے زیادہ مناسب رکھتی ہے۔ لیکن طرز بیان کے لحاظ سے نظیری کی کچھ خصوصیت نہیں معلوم ہوتی۔

ناظم ہروی کی چند بیتیں مشہور ہیں، جن میں عنصری سے لے کر جامی تک ہر زمانے میں جو شاعر سربراہ ہوا ہے اس کا نام لیا ہے۔ ان کے آخر میں مرزا نے ایک بیت اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے۔ چوں کہ اصل مثنوی اور اس پر مرزا کا اضافہ فائدے اور لطف سے خالی نہیں ہے اس لیے ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں۔

شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
بہ فردوسی آمد کلاہ نہی
بہ خاقانی آمد بساط سخن
نظامی بہ ملک سخن شاہ گشت
سرچتر دانش بہ سعدی رسید
سخن گشت بر فرق خسرو تشار
ز جامی سخن را تمسای رسید

شنیدم کہ در دور گاہ کہن
چو اورنگ از عنصری شد ہی
چو فردوسی آورد سر در کفن
چو خاقانی از دار فانی گذشت
نظامی چو جام اہل در کشید
چو اورنگ سعدی فروشد ز کار
ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید

اس کے بعد جوگی ناظم کے بیان میں رہ گئی تھی، اس کو مرزا نے یوں پورا کیا ہے،

زجائی بہ عرفی و طالع رب رسید ز عرفی و طالع رب بہ غالب رسید
 اگرچہ مرزا نے بیدل اور ان کے متبعین کی زبان اور ان کے انداز بیان
 میں شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا اور اس خصوص میں وہ اہل زبان کے طریقے سے سر مو
 تجاوز نہیں کرتے تھے، مگر خیالات میں بیدہمت مدت تک باقی رہی۔ لیکن آخر کا
 تغزل میں بے انتہا گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہو گئی تھی۔ ہم اس مقام پر ان کی غزلیات
 میں سے زیادہ تر صاف صاف اور کسی قدر وہ اشعار بھی نقل کریں گے جن کے بغیر
 مرزا کی طرز تکمیل اور ان کے شعر کی خصوصیت ظاہر نہیں ہو سکتی۔

انتخاب غزلیات فارسی

توحید

شاہد حسن ترا در روش و سبزی طرہ پر خم صفات موی میاں ماسوا
 یعنی اگر تیرے حسن کو مثل شاہد ان مجازی کے ایک شاہد قرار دیا جائے، تو اس کا
 طرہ پر خم کیا ہوگا، صفات الہی، اور اس کا ٹوٹے میاں کیا قرار پائے گا، ماسوی
 اللہ۔ شعراے متصوفین صفات الہی کو اکثر زلف و گیسو اور طرہ و کاکل کے ساتھ
 تعبیر کرتے ہیں اور چوں کہ ماسوی اللہ کو صوفیہ معدوم محض جانتے ہیں اور معشوق
 کی کمر کو عشاق معدوم قرار دیتے ہیں، اس لیے شاہد حسن حقیقی کی کمر ماسوی
 کو قرار دیا ہے۔

توحید

آب نہ بخشی بزور خون سکندر ہد جاں نہ پذیری بہ بیج نقد خضر ناروا
 ہذر یعنی حلال۔ مشہور ہے کہ سکندر آب حیوان کی تلاش میں گیا تھا، مگر ناکام رہا۔

کہتا ہے کہ تو زورِ حکومت سے کسی کو پانی نہیں دیتا۔ پس اگر سکندر آبِ حیوان کے نہ ملنے کے سبب ہلاک ہو جائے تو ہو۔ دوسرے مصرع میں خدا کی بے نیازی کا بیان ہے، یعنی خضر جان جیسی عزیز چیز مفت نذر کرتا ہے، مگر تو اس کو قبول نہیں کرتا اور اس لیے اس کو کسی طرح موت نہیں آتی۔

توحید

بزمِ ترا شمع و گلِ خستگی بو تراب سازه ترا زیر و بزم، واقعہ کربلا یعنی تیرے ہاں وہی سب سے زیادہ مقرب اور برگزیدہ ہیں جو سب سے زیادہ نشانہٴ مصائب و حوادث و آلام ہیں۔

توحید

سادہ ز علم و عمل مہر تو در زیدہ ام مستی ما پاندار، بادہ مانا شستا ناشتا نہار منہ رہنا اور کچھ نہ کھانا نہ پینا۔ دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں کہ گویا میں نے شراب کا ایک قطرہ نہیں پیا، مگر نشے میں ہر وقت چود رہتا ہوں؛ یعنی گو علم و عمل کچھ نہیں رکھتا، مگر تیری محبت میں سرشار ہوں۔

قطعہ

توحید

اے خاکِ درت قبلہٴ جان و دل غالب کز فیض تو پیرایہٴ ہستی ست جہاں را تا نام تو شیرینیِ جاں دارہ بہ گفتن در خویش فرو بردہ دل از مہرِ زباں را یعنی آں حضرت کا نام مبارک لینے سے زبان میں ایسی شیرینی اور ملاوت پیدا ہوئی کہ دل نے پیار سے اس کو اپنے اندر اتار لیا۔

فخریہ

ماہماے گرم پروازِ کیم، فیض از ما مجوسے سایہٴ بچوں دودا بالامی رود از بالِ ما

یعنی ہماری پرواز میں اسی قدر گرمی ہے کہ جس طرح دھواں آگ سے اوپر ہی
 اوپر جاتا ہے، اسی طرح ہمارے پروں کا سایہ نیچے نہیں پڑتا، بلکہ دھوئیں کی طرح
 پروں کے اوپر ہی اوپر جاتا ہے۔
 شوخی

حالِ ما از غیر می پرسی و منت می بریم آگہی بارے کہ آگہ نیستی از حالِ ما
 یعنی تو جو ہمارا حال غیر سے پوچھتا ہے، ہم اسی بات کے شکر گزار ہیں۔ غنیمت ہے
 کہ تو اس بات سے تو آگاہ ہے کہ تجھ کو ہمارے حال کی خبر نہیں
 امید

دلِ مایوس را تسکین ببردن می توان دادن چه امید است آخر خضر و ادریس و مسیح مارا
 تصوف

خطِ برہتی عالم کشیدیم، از مشہ بستن ز خود رفتیم و ہم با خویش تن بُردیم دنیا را
 عاشقانہ

وقفِ تاراج غمِ تست، چه پیدا، چه نہاں، بچورنگ از رخِ مارفت دل از سینہ ما
 جوئے از بادہ و جوئے ز عسل دارد قلند
 فخریہ

خاربا از اڑ گرمی رفتارِ سخت منتے بر قدمِ راہ روانِ ستِ را
 یعنی راہ کے تمام خار و خس میری گرم رفتاری سے جل گئے ہیں، پس رہیروں
 کے قدم پر میلِ حسان ہے کہ میں نے ان کے لیے رستہ بالکل صاف کر دیا ہے۔
 یہ تمام مضمون استعارے میں بیان ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نازک خیالی کے
 طریقے میں جو الجھاؤ تھے، وہ سب میں نے اس طریقے پر چل کر دور کر دیے ہیں اور
 آئندہ آنے والوں کے لیے راہ صاف کر دی ہے۔

تمثیل حالاتِ خود

رہرو تفتہ در رفت بہ آہم غالب — تو شہ بر لب جو ماندہ نشانست — مرا
یعنی میری مثال اس مسافر کی سی ہے جو گرمی اور ٹو سے جلا بھٹا پانی کو دیکھ کر،
بے اختیار اس میں کود پڑے اور ڈوب جائے، اور ندی کے کنارے پر اس کا زادِ راہ پڑا
رہ جائے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہاں کوئی مسافر ڈوبا ہے۔ اس شعر میں مرزا نے اپنی
خاص حالت کو تمثیل کے پیرایے میں بیان کیا ہے۔ گویا یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں لوگوں نے
مجھ کو محض اسکل اور قرائن سے پہچانا ہے، ورنہ میں جیسا کہ میں ہوں، سب کی نظروں
سے مخفی رہا ہوں۔

دنیا

سایہ و چشمہ بصر آدم عیشے دارد — اگر اندیشہ منزل نمود رہزنِ ما
یہ دنیا کی مثال ہے، یعنی اگر آخرت کا کھٹکانہ لگا ہوا ہو، تو دنیا خاصی آرام کی جگہ ہے
مگر چونکہ یہ کھٹکانہ لگا ہوا ہے، اس لیے یہاں آرام کے ساتھ دم نہیں لیا جاسکتا۔

زارِ نالی

می پردِ مورا مگر جاں بسلامت میرد — تا چہ برقِ ست کہ شد نامزدِ خرمنِ ما
یعنی معلوم نہیں کہ ہمارے خرمن پر کونسی بجلی گرنے والی ہے کہ چیونٹے جان بچانے
کے لیے پہلے ہی سے اڑے جاتے ہیں۔ تمثیل کے پیرایے میں یہ ظاہر کرتا ہے کہ دوست
اور رفیق کوئی ہمارے رنج میں شریک نہیں ہوتا۔

نخربہ

سخنِ مازِ لطافت نہ پذیردِ تحسیر — نہ شود گردِ نمایاں ز رم تو سنِ ما
یعنی ہمارے خیالات اس قدر لطیف ہیں کہ تحریہ میں نہیں آسکتے، گویا ہمارے گھوڑے
کی دوڑ میں گرد و غبار بالکل نہیں اٹھتا۔

مغزیہ

مانہ بودیم بدیں مرتبہ راضی، غالب! شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما
یہ ملکہ فطری کی طرت اشارہ ہے۔ یعنی ہم نے شاعری خود نہیں اختیار کی بلکہ ملکہ شاعری
نے خود ہم کو مجبور کیا کہ ہم اس کو اپنا فن قرار دیں۔

شکایت

بائندہ خود ایں ہمہ سختی نمی کنند خود را بزور بر تو مگر بستہ ایم ما
یہ خطاب خداوندہ حقیقی کی طرت ہے، یعنی کیا ہم نہ بردستی سے تیرے سر ہو گئے ہیں کہ ہم
پر ایسی سختی کی جاتی ہے۔

مغزیہ

بر روی حاسداں درد و زنج کشودہ رشک از بہر خویش جنت در بستہ ایم ما
یعنی ہم اپنا کمال دیکھ کر آپ ہی خوش ہوتے ہیں گویا ہم اپنے لیے جنت در بستہ ہیں۔ پس
چوں کہ ہماری جنت کی کیفیت سے اور جو اس میں لذت و راحت ہے اس سے حاسد لوگ
بے خبر ہیں اس لیے رشک سے ان کی یہ حالت ہے کہ گویا ان پر دوزخ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔
تصوف

سوز ترا رواں ہمہ وہ خویش تن گرفت از داغ تنہتے بہ جگر بستہ ایم ما
یعنی تیرے سوز اور تیری آگ کو جان نے بالکل اپنے اندر لے لیا ہے؛ اور ذرہ برابر
کسی کے لیے اس سے حقہ نہیں چھوڑا۔ پس ہم جو اپنے جگر کو داغدار قرار دیتے ہیں، حقیقت
اس پر تہمت رکھتے ہیں۔

عاشقانہ

با چوں توئے معاطہ بر خویش منت است
از شکوہ تو شکر گزار خودیم ما

زادانی

روے سیاہ خویش ز خود ہم ہفتہ ایم
رندانہ شمع غموشیں کلبہ تار خودیم ما

کدوے چوں زے یابم چناں بر خویشتن ! لم
کہ پندارم سرآمد روزگار بے نوائیہا
یعنی ایک شراب کا بھرا ہوا تونا مجھ کو مل جاتا ہے، تو میں پھولا نہیں سماتا اور یہ سمجھتا
ہوں کہ بس، اب بے سروسامانی کا زمانہ ختم ہوا۔
رندانہ

سغن کوتہ، مرا ہم دل بتقویٰ مائل ست، اما
زنگب زاہد افتادم بہ کافر ماجرائیہا
یعنی زاہد کے ساتھ ہم ہمیشہ ہونے سے عار آتا ہے، اس لیے میری کفار کی سی حالت ہے،
ورنہ تقویٰ کی طرف مجھے بالطبع میلان تھا۔
اخلاق

در شرب حریفان منع است خود نمائی
بگر کہ چوں سکندر آئینہ نیست جم را
حریفان کا لفظ فارسی میں ایسا ہے، جیسا اردو میں یار لوگوں کا لفظ؛ اور لفظی معنی
اس کے ہم ہمیشہ ہیں۔ جب شراب خوار کسی کو حریف یا حریفان کہتا ہے تو اس سے مراد شراب خوار
ہوتی ہے۔ کہتا ہے کہ ہم شراب خواروں کے مشرب میں خود نمائی منع ہے۔ دیکھو، جمشید جو
بادہ نوشی میں ضرب الشل ہے، اس کے ہاں آں خود نمائی یعنی آئینہ جیسا کہ سکندر کے
ہاں تھا، نہ تھا۔

شونی

زاگستی و باد یگراں گرو بستی
بیا کہ عہد وفا نیست استوار، بیا

یعنی اگر تو نے ہم سے توڑ کر غیروں کے ساتھ ہیمان ونا باندھا ہے تو اس کا خیال نہ کر
اور بے تکلف ہمارے پاس چلا آ، کیوں کہ عہد ونا ٹوٹنے ہی کے لیے باندھا جاتا ہے،
وہ کبھی استوار نہیں ہوتا، جیسا کہ ہمارے ساتھ بندھ کر ٹوٹ گیا۔
عاشقانہ

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد ہزار بار برو، صد ہزار بار بسا
یعنی وداع میں اور لطف ہے اور وصل میں اور لذت ہے۔ پس ہزار بار جا اور لاکھ بار
آ۔ صد ہزار بار نے شعور کو زیادہ بلند کر دیا ہے کہوں کہ شاعر باوجود اسے کہ لذت میں وداع
اور وصل دونوں کو یکساں قرار دیتا ہے، مگر بھر بھی اپنے مطلب کی بات کو نہیں بھولا،
اور جانے کے لیے ہزار بار اور آنے کے لیے صد ہزار بار کا لفظ استعمال کیا ہے۔
منصوفانہ

رواج صومعہ ہستی ست زینہار مرد ستارے میکہ مستی ست ہوشیار بیا
یعنی صومعہ میں ہستی و پند و غور کا رواج ہے، وہاں ہرگز نہ جا، اور میکہ
کی جو کچھ پہنچی ہے، وہ ہستی ہے، یہاں ذرا ہوشیار ہو کر یعنی ظن عالی لے کر آنا چاہیے۔
مستی حاصل کرنے کے لیے ہوشیار ہو کر آنا اس میں جو لطف ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔
ریشک

چوں بہ قاسد بسیرم پیغام را ریشک نگزارد کہ گویم نام را
زار حالی

کشتہ در تاریکی روزم نہاں کو چراغ اتا بجویم شام را
یعنی میرا دن اس قدر تاریک تھا کہ شام کی تاریکی اور اس کی تاریکی
دونوں مل گئیں اور یہ نہ معلوم ہوا کہ شام کب ہوئی اور دن
کب چھپا۔

خلوص

تانیفتہ ہر کہ تن پرور بود خوش بود اگر دانہ نبود دام را
وہی مضمون ہے جو مرزا نے اردو میں اس طرح باندھا ہے،
طاعت میں تار ہے نہئے وانگیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی کے کر بہشت کو
رندانہ

ولتاں درخشم و غالب بوسہ جو شوق نشناسد ہی ہنگام را
عاشقانہ

در بحر طرب بیش کند تاب و نیم را مہتاب کعبہ ارسیاہ ست شہم را
یعنی جدائی کے زمانے میں جو سامان عیش و طرب مہیا ہوتا ہے اس سے میری بیقراری
اور تپش زیادہ بڑھتی ہے۔ پس چاندنی جو کہ عیش و طرب کی محرک ہے وہ میرے
کے حق میں ارسیاہ کے پھین کا حکم رکھتی ہے۔

غیرت

تشنہ لب بر ساحل دریا ز غیرت جان ہم گری موج افتد گمان چین پیشانی مرا
کہتا ہے کہ میں کیسا ہی پیاسا ہوں، لیکن اگر دریا کی موج پر مجھ کو یہ شبہ بھی گزرے
کہ دریا نے مجھے دیکھ کر پیشانی پر بل ڈالا ہے تو میں غیرت کے مارے ساحل دریا پر
جان دے دوں گا، مگر حلق تر نہ کروں گا۔

عاشقانہ

پایانِ محبت یا دمی آرم زمانے را کہ دل عہد و فنا نابلستہ دادم دلستانے را
اس شعر میں اپنی نادانی اور حماقت ظاہر کرتا ہے کہ اب انتہا سے محبت میں جب کہ معشوق کی
طرف سے ظلم و ستم و بے وفائی کی کچھ حد نہیں رہی، مجھے یہ خیال آتا ہے کہ افسوس
ہے جب میں نے اس کو دل دیا تھا اس وقت وفاداری کا عہد نہ لے لیا۔ حالانکہ

طاہرینا کوئی اختیاری بات نہیں ہے کہ جس طرح بیع و شرا اور لین دین کے وقت شرطیں کر لیتے ہیں اسی طرح دل دیتے وقت بھی کوئی شرط کر لی جاتی۔

رندانہ

آوازہ شرع از سر منصور بلند است از شب روی ماست شکوہ عسرس ما
شب روی: چوری کے لیے راتوں کو پھرنا۔ کہتا ہے کہ اگر مجرموں کو تعزیر نہ دی جائے
تو شریعت کی شان و شوکت اور حکومت کی شکوہ ظاہر نہیں ہوتی۔ پس ہم جو مرتکب
جرائم ہوتے ہیں، گویا شریعت اور حکومت کی شان بڑھاتے ہیں۔

زاد نالی

وقت است کہ خون جگر اندر بجوشد چند آنکہ چکد از مرثہ و ادرس ما
کہتا ہے کہ میری مظلومی اب اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ وہ وقت آن پہنچا ہے کہ خون
جگر درد سے اس قدر ابلے کہ حاکم و ادرس کی پلوں سے جا چکے۔

آزادی

و در ہر فرد رفتہ لذت نتوان بود بر تنہا نہ بر شہد نشیند مگس ما
یعنی ہم دنیا کی لذتوں سے متمتع ہوتے ہیں، مگر ان میں پھنستے نہیں، جیسے وہ مکھی جو
قندریٹھتی ہے کہ جب چاہا اڑ گئی، نہ وہ مکھی جو شہد پر بیٹھتی ہے کہ پھر اُبھر نہیں سکتی۔

ندانہ

بارہ مشکبوی ما بید و کن رکشت ما کوثر و سبیل ما طوبیٰ ما بہشت ما

عاشقانہ

حسرت وصل از چہ رُدا چوں بنیال سرخوشیم ابر اگر بایستد بر لب جوست کشت ما
یعنی جب کہ ہم خیال دوست ہی میں مست و سرشار ہیں تو وصل کی حسرت کیوں کریں۔
اگر ابر نہیں برستا تو نہ برسے، ہماری کھیتی خود ندی کے کنارے پر ہے۔

رندانہ

برودہ صدر العین لبس، بر سر صد ہزار غم
 گز نہی در آفتاب، بادہ چکد ز خشتِ ما
 بادہ اگر بود حرام، بذلہ خلافِ شرع نیست
 دل نہ نہی بہ خوب، طعنہ وزن بزشتِ ما
 زہاد کی طنح خطاب ہے جو شرابِ نخوری اور رندانہ بذلہ سخی دونوں کو برا سمجھتے ہیں کہتا ہے
 کہ اگر شراب حرام ہے تو بذلہ سخی تو خلافِ شرع نہیں ہے؛ اگر تو شراب کو جو ہماری نفیس چیز
 ہے، پسند نہیں کرتا، تو بذلہ سخی جو ہماری ادنیٰ درجے کی چیز ہے، اس پر تو طعن مت کر۔
 تفسیر مصرع طرح

گفت بحکمِ حسرتی غالبِ خستہ این غزل
 "شاد بہیج می شود، طبع وفا سرشتِ ما"
 یہ غزل غالباً اُس زمانے کی لکھی ہوئی ہے جب کہ نواب مصطفیٰ خان مرحوم متخلص بہ حسرتی
 کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا اور علوی، صہبائی، آذرہ، مومن اور غیر ہم سب
 اس میں شریک ہوتے تھے۔ اس مقطع میں مرزا نے مصرع طرح کو تفسیر کیا ہے۔
 اب اس کے یہ معنی ہونگے کہ ہم سے جو اس طرح پر غزل لکھنے کی فرمائش کی گئی، ہماری
 طبع وفا سرشت دوست کے اتنے ہی التفات سے شاد شاد ہو جاتی ہے۔
 عاشقانہ

مردم ز فرطِ ذوق و تسلی نہ می شوم
 یارب بجا برم لبِ خنجر ستارے را
 کہتا ہے کہ دوست کے خنجر نے وہ مزادیا ہے کہ اس کی تعریف کرتا کرتا مر گیا اور پھر
 بھی تسلی نہ ہوئی۔ الہی اس لبِ خنجر تاکو کہاں لے جاؤں کہ جہاں جا کر تسلی ہو۔

رندانہ

شبم تاریک و منزل دور و نقشِ جاہِ ناپیدا
 ہلاکم جلوہ برقِ شرابِ گاہ گاہ ہے را
 پہلے مصرع میں اپنی مشکلات کو شبِ تاریک وغیرہ کی تمثیل میں بیان کیا ہے۔ دوسرے
 مصرع میں کہتا ہے کہ میں ہلاک یعنی قربان ہوں برقِ شراب کی چمک پر جو کبھی کبھی چمک

جاتی ہے اور اس اندھیرے میں کچھ روشنی نظر آ جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ شراب جو کبھی کبھی مل جاتی ہے، صرف اس کی بدولت میرا غم غلط ہوتا ہے۔
رندانہ

مے باندازہ حرام آمدہ، ساقی! برخیز شیشہ خود بشکن بر سر پیانہ ما
بر خلاف عقل و شرع کے کہتا ہے کہ اے ساقی، شراب اعتدال کے ساتھ پینی حرام ہے،
تو اٹھ اور اپنا شیشہ یعنی بوتل یا صراحی ہمارے گلاس پر دے مار۔ اس شعر میں افراط
شوق کی تصویر کھینچی ہے، خواہ کسی چیز کا شوق ہو۔ جب کسی چیز کی طلب اور خواہش
حد سے گزر جاتی ہے تو اس بات کی حس نہیں رہتی کہ اپنے طرف کے موافق اس کی
خواہش کی جائے۔ جب پانی کی پیاس نہایت شدت سے ہوتی ہے، تو پیاسا دریا کو
دیکھ کر یہ چاہتا ہے کہ سارے دریا کو پی جاؤں پس گو کہ مضمون شعر شراب کی تمثیل
میں بیان کیا گیا ہے، لیکن اس کا مصداق ہر چیز کا مشتاق قرار پاسکتا ہے۔
زارغالی

مُو بر آید ز کف دست اگر دہقاں را نیست ممکن کہ کشد ریشہ سر از داندہ ما
ظاہر ہے کہ انسان کی ہتھیلی میں بال پیدا ہونے کی قابلیت نہیں رکھی گئی۔ کہتا ہے کہ اگر
کاشتکار کی ہتھیلی میں بال بھی نکل آئیں، تو بھی یہ ممکن نہیں کہ ہمارا دانہ پھوٹ کر اُس
میں سے ریشہ نکل آئے، یعنی ہماری کوششوں کا مشکور ہونا محال ہے۔
تصوف

خرابیم و رضایش در خرابیہاے ما باشد ز چشم بد نگہ دارد خدا ما دوست کا ماں را
خراب، مست، دیرین اور تباہ تینوں معنوں میں آتا ہے۔ دوست کا وہ شخص جس کی
حالت دوستوں کی خواہش کے موافق ہو، یعنی عمدہ حالت ہو۔ کہتا ہے کہ ہم خود بھی
خراب ہیں اور دوست کی خوشی بھی یہی ہے کہ خراب حال رہیں۔ پس ہم دوست کا مول

کو جن کی حالت دوست کی مرضی کے موافق ہے خدا تعالیٰ نظرِ بے محذور رکھے۔

مناجات

بسا افتادہ سرست و بسا افتادہ در طاعت
تو دانی تا بلطف از خاک برداری کد اماں را
تصوٹ

عالم آئینہ رازست، چہ پیدا، چہ نہاں
یعنی اگر تو سوچ نہیں سکتا تو نگاہ ہی سے عالم کو دیکھ کہ اس کا ظاہر و باطن سب مظهرِ
اسرار الہی ہے۔
تصوٹ

فرصت از کف مرہ و وقت غنیمت پندار
نیست گر صبح بہاری، شبِ ماسہ دریا
شوخی

گر پس از جور بہ انصاف گراید، چہ عجب
کھتا ہے کہ ظلم و ستم کے بعد اگر وہ انصاف کی طرف مائل ہو جائے تو کچھ عجب نہیں
یعنی اپنے پچھلے جرم یا ذکر کے حیا سے ہم کو منہ نہ دکھلائے تو تعجب نہیں، مطلب یہ کہ
انصاف بھی کرے گا تو اس طرح کرے گا کہ ہم اس کے دیکھنے سے محروم رہیں۔
شوخی

بودش از شکوہ خطا ورنہ سری داشت بمن
خیالی پلاؤ پکاتا ہے تاکہ اسی طرح اپنے دل کو تسکین دے۔
معذرت

باچنیں شرم کہ از ہستی خویشش باشد
غالب اریخ برہ دوست نساید چہ عجب
یعنی اس شرم سے کہ اپنے تئیں غلطی سے موجود سمجھ رہا ہے، اگر غالب خدا کے آگے
سجدہ نہ کرے تو کچھ عجب نہیں۔

غزل نعتیہ

حق جلوہ گر ز طرز بیان محمدؐ است
آئینہ دار پر تو مہرست ماہتاب
تیر قضا ہر آئینہ در ترکش حق است
دانی اگر بہ معنی لولاک داری
ہر کس قسم بد آنچہ عزیزست ، می خورد
واعظ! حدیث سایہ طوبیٰ فرود گزار
بنگرد و نیمہ گشتن ماہ تمام را
غالب! ثنائی خواجہ بہ یزدان گذاشتیم
یہ غزل مرزا کے اپنی عام طرز کے خلاف سہایت صاف اور بلیغ لکھی ہے۔ راقم نے مرزا
کی زندگی ہی میں اس غزل کی تخمیں کی تھیں اور مرزا صاحب کو بھی دکھائی تھی۔ چوں کہ وہ
تخمیں اب تک شایع نہیں ہوئی، اس لیے مقتضائے مقام یہ ہے کہ اس کو بھی اس غزل
کے ساتھ نقل کر دیا جائے،

اعجاز از خواص لسان محمدؐ است
گر نور و گر ہدی کہ ازان محمدؐ است
”آرے کلام حق بہ زبان محمدؐ است“
عین الحیوۃ گم بہ دہان محمدؐ است
”حق جلوہ گر ز طرز بیان محمدؐ است“
دانی ز پیش چشم تو بر خیزد ار حجاب
باشد ظہور روشنی عارض از نقاب
”شان حق آشکار ز شان محمدؐ است“
کز نور شمع پردہ فانوس راست تاب
”آئینہ دار پر تو مہرست ماہتاب“

لطف خداست اگر بسیر کس نہاد دست
واند کسیک شد زبے نا کر میث مست
قہر خداست چوں ز سر کین بجلد جست
”تیر قضا ہر آئینہ در ترکش حق است“

”اما کشاد آں ز کمان محمد است“

گویی، اگر بعالم ادراک و ارسی
بینی، اگر بدیده و ذاک و ارسی
سنجی، اگر برترتبه خاک و ارسی
”دانی، اگر بمعنی لولاک و ارسی“
”خود هر چه از حق است، ازان محمد است“

شاید بقتل عاشق و عاشق بحال و غد
مجنون بیایه لیلی و لیلی به فرق خود
مومن به آل احمد و آتش بروی جد
”هر کس قسم بدانچه عزیزست، می خورد“
”سوگند کردگار بحسان محمد است“

اے خامر بوصف قامت معشوق کم نگار
اے دل! سخن ز راست قدان در میان میار
قمری! ز ذکر سر و نفس را نگاه دار
”واعظ! حدیث سایه طوبی فرو گزار“
”کایه نجاسخن ز سر و روان محمد است“

عکسش بمهر و ماه روانست چوں قضا
دیدنی که باز گشتن خورشید بر قضا
بوده است بر اشاره ابروے مصطفی
”بنگرد و نیمه گشتن ماه تمام را“
”کایه نیمه جنبش ز میان محمد است“

آنجا که از مناقب عترت سخن رود
وز آل و از صحابه امت سخن رود
و آن کایه نیمه ز ختم رسالت سخن رود
”و ز خود ز نقش مهر نبوت سخن رود“
”آن نیز نامور ز نشان محمد است“

همت بمدرج شه من و عالی گماشتیم
گفتیم و از نگاشتنی با نگاشتیم
چون کلام دلب فرا خور و صفش نداشتیم
”غالب! شنای خواجه به یزدان گذاشتیم“
”کایه ذات پاک مرتبه دان محمد است“

شوخی

بیخود بوقت ذبح تمیدن گستاخ من
دالسته دشنه تیز زه کردن گنا و کیست؟

یاد از عدو نیارم و اینہم زدور بینی ست کاندہ دلم گذشتن بادوست ہم نشینی ست
 کہتا ہے، میں جو رقیب کا خیال دل میں نہیں لاتا، یہ دور بینی کی بات ہے کیوں کہ میرے
 دل میں ہر وقت دوست رہتا ہے، اگر رقیب کا خیال دل میں آئے گا تو گویا رقیب دوست
 کے ساتھ ہم نشین ہو جائے گا۔
 شوخی

من سوے او بہ بینم، داند از یہیالی ست او سوے من نہ بیند، دامن از شرمگینی ست
 عاشقانہ

چہ فتنہ پا کہ در اندازہ کمان تو نیست قیامت ست! دل دیر مہربان تو نیست
 رواں فداے تو! نامے کہ بروہ ناصح! رہے لطافت ذوقیکہ، در بیان تو نیست!
 چوں کہ ناصح ترک عشق کی نصیحت کرتا ہے اس لیے معشوق کا نام عاشق کے سامنے
 اچھی طرح نہیں لیتا۔ شاعر ناصح کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے کہ میری جان تجھ پر قربان
 ہو، تو نے کس کا نام لیا ہے؟ وہ کیسی لطافت اور لذت ہوگی، جو کہ تیرے بیان میں
 نہیں ہے؟ یعنی جس طرح اس کا نام لینا چاہیے تھا اگر اس طرح تو بھی وہ نام لیتا، تو کیسی
 لطافت اور لذت تیرے بیان میں ہوتی۔ مگر چوں کہ ناصح نے بڑی طرح سے اس کا نام
 لیا ہے، اس لیے کہتا ہے کہ وہ کیسی نشت ہوگی جو تیرے بیان میں نہیں ہے۔
 عاشقانہ

دل از خموشی علت امیدوار چراست چہ گفتم بہ زبانی کہ دردہان تو نیست
 معشوق نے منہ سے کچھ نہیں کہا مگر اس کی نگاہ یا تبسم یا کسی اور ادا سے اس کے
 انتہات یا وصل کی امید بندھی ہے۔ پس کہتا ہے کہ تیرے بلبل کی خاموشی سے
 میرا دل اس قدر کیوں امیدوار ہے؟ تو نے اس زبان سے جو تیرے منہ میں نہیں ہے کیا
 کہہ دیا ہے جس سے اس کو امید بندھی ہے۔

عاشقانہ

گمانِ زلیست بود بر منت زبیردی بدستِ مرگِ اولے بدتر از گمانِ تو نیست
اخلاق

بے تکلف در بلا بودن مہ از بیمِ بلاست قعرِ دریا سلسبیلِ وُروے دریا آتشِ ست
دوسرے مصرعے میں عربی کے مضمون کو اٹا ہے۔ اُس نے اس لحاظ سے کہ دریا کے
اوپر کی سطح سے راحت حاصل ہوتی ہے اور دریا کی تہ میں پہنچنے سے وہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے
جو آگ میں جل جانے سے ہوتا ہے، یوں کہا تھا:

وُوی دریا سلسبیلِ و قعرِ دریا آتشِ ست

مرزا کہتے ہیں کہ بلا کا خون خود بلا سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ چناں چہ دریا میں انسان
جب ہی تک بے چین رہتا ہے جب تک ڈوب جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جب ڈوب
گیا، پھر کچھ بھی بے چینی باقی نہیں رہتی۔ پس یوں کہنا چاہیے کہ
قعرِ دریا سلسبیلِ وُروے دریا آتشِ ست

شوخی

پاک خور امروز و زہار از پے فردا منہ در شریعت بادہ امروز آبِ فردا آتشِ ست
جو لوگ شرابِ ظہور کی امید پر دنیا میں شراب نہیں پیتے، وہ گویا جو شراب آج نہیں پیتے،
اُس کو کل کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں۔ پس ان سے کہتا ہے کہ ”پاک خور امروز“ یعنی سب
آج ہی بیٹھ دے، اور کل کے لیے مت رکھ، کیوں کہ شریعت میں شراب آج تو پانی ہے،
اور کل وہی آگ ہو جاوے گی
تصویر

زوہم نقشِ خیالی کشیدہ ورنہ وجودِ خلقِ چو عنقا بدسرنمایا بست
قوی فتارہ چو نسبتِ ادبِ مجو غالب! ندیدہ کہ سوی قباہِ پشتِ محراب است!

یعنی جب تعلق اور نسبت قوی ہو جائے، تو پھر آدابِ ظاہری کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔
دیکھو قبلہ کی طرف پشت کرنا ہر ایک کے لیے خلافتِ ادب ہے، مگر محرابِ مسجد جس کو قبلہ سے
نہایت مضبوط تعلق ہے، اس کی پشت ہمیشہ قبلہ ہی کی طرف رہتی ہے۔
شوخی

ہر چہ فلکِ نخواستہ است، بچکس از فلکِ نخواست
ظرفِ فقیہ نے نہ جست، بارہ، مگر کز نخواست

تصویر

بحث و جدل بجای ماں، میکدہ جوی کا ندیاں
کس نفس از جملِ نزاکت سخن از ذکِ نخواست
بجائے ماں بمعنی بجائے دارِ یعنی بحث و جدل کو یو نہیں رہنے دے اور مینا نے میں جا
کہ وہاں نہ جمل کا جھگڑا ہے، نہ ذک کا قصہ ہے۔ جمل سے مراد جنگِ جمل ہے، جس میں
حضرت عائشہ جمل یعنی اونٹ پر سوار ہو کر حضرت امیر سے لڑنے گئی تھیں۔ ذک ایک
کعبور کا باغ تھا جس پر حضرت سیدۃ النساء فاطمہ زہرا نے حضرت ابوبکر صدیق کی فلاحت
میں وراثت کا دعویٰ کیا تھا۔ یہ دونوں جھگڑے منجملہ ان بے شمار نزاعوں کے ہیں جن پر
مستی شیعہوں میں ہمیشہ سر پھٹول رہتی ہے۔
فوزیہ

دل جلوہ میدہد ہنر خود در انجمن رجمے مگر بجانِ حسودش نماندہ است
یعنی جب تک میں اپنے تئیں چھپاتا تھا، حاسدوں کو کچھ آزار نہیں پہنچاتا تھا، اب علی الاعلان اپنے
ہنر ظاہر کرنے لگا ہوں۔ گویا اب حاسدوں کی جان پر رحم باقی نہیں رہا۔
بے دامی

غالب زباں بریدہ و آگندہ کوشش نیست اما داغِ گفت و شنودش نماندہ است

عاشقانہ

بلبل! دلت بنالہ خونیں بہ بند نیست
 یعنی اے بلبل! تو اپنے نالہ خونیں کے سبب ضیق میں نہیں ہے، جب چاہتی ہے، نالہ
 کرتی ہے۔ پس تو آرام سے زندگی بسر کر کہ تیرا یار یعنی گل مشکل پسند نہیں ہے، بخلان
 ہمارے کہ ہم کو رونے اور فریاد کرنے کی بندی ہے، حال آنکہ نالہ خونیں سے دل بھرا
 ہوا ہے۔
 تصوف

بے خود بزریر سایہ طولی غنودہ اند
 یعنی جو لوگ امانی و آمال کے پھندے میں گرفتار ہیں ان کا سفر کچھ لمبا چوڑا نہیں ہے،
 ان کا منتہا مقصود طولی کے سایہ میں آرام کرنا ہے۔
 شکایت سخن

اختری خوشتر از نیم بجاں می بایست
 حرم پیر مرا بخت جواں می بایست
 فخریہ
 تاجک مایہ بدر یوزہ خود کارانہ شود
 نریخ پیرایہ گفتار گراں می بایست
 فخریہ
 گفتم بر در کار سخنور چو من بسی است
 گفتند اندر یں کہ تو گفتی سخن بسی است
 مشکیں غزالہا کہ نہ بینی بر پیچ دشت
 در مرغزار ہائے خطا و غنن بسی است
 در صفو نبوزم ہمہ آں چہ در دل است
 در بزم کتراست گل و در چمن بسی است

رندانہ

دراز دستی من چاکے ار نگنذ چہ عیب!
 ز پیش دلق و رعا با ہزار پیونداست

یہ گفتہ کہ یہ تلخی بسا زوہد پذیر
برو کہ بارہ ما تلخ تر ازین پندست
یہ خطاب نامح کی طرف سے ہے۔

عاشقانہ

اگر نہ بہرین، از بہر خود عزیزم دار
کہ بندہ، خوبی او خوبی خداوندست
تصوف

در گرم روی سایہ و سرچشمہ بنجوئیم
بما سخن از طوبی و کوثر نتوان گفت
یعنی ہم کو آگے جانے کی جلدی ہے۔ ہم سایہ و سرچشمہ یعنی طوبی اور کوثر پر آرام نہیں
لے سکتے۔

تصوف

آں راز کہ در سینہ نہانست، نہ غطاست ..
بردار تو ان گفت، بہ منبر نتوان گفت
شوخی

کارے عجیب افتاد بدیں شیفہ مارا
مومن نہ بود غالب و کافر نتوان گفت
زندانیہ

گفتم، ز کہ پرسم اثر عمر گزشتہ
ساقی بہ قدح بارہ رہ سالہ فروریخت
شوخی

در قالبِ ملامت اثرش پردہ کش شد
خاکے کہ قضا در تن گو سالہ فروریخت
دوستی

گر منافق، اصل ناخوئل؛ در موافق، ہجر تلخ

دیدہ داغ نم کرد روئے رستاں دیدن نہاشت

یعنی دوستوں کا منہ دیکھنا اور ان سے تعارف پیدا کرنا نہیں چاہیے تھا کیوں کہ جو
منافق ہیں ان کا ملنا ناگوار ہے اور جو موافق ہیں، ان کی جدائی تلخ ہے۔

انسان

میر و آدم از امانت ہر چہ گردوں بر متافت ریختے بر خاک، چوں در جام گنجین نشین شدت
یعنی بار امانت میں سے جو کچھ آسمان سے نہ اٹھ سکا وہ انسان نے اٹھا لیا۔ گو یا جب شراب
جام میں نہ سما سکی تو خاک پر گر پڑی۔ خاک کا لفظ انسان کے لیے اور جام آسمان کے لیے
کس قدر مناسب واقع ہوا ہے۔ اور بار امانت جو انسان پر ڈالا گیا تھا اس کی تشبیہ اس
شراب سے جو پیالہ چھلکنے سے زمین پر گر پڑے، کیسی لطیف و پاکیزہ تشبیہ ہے۔
تصوّن

قفس و دام را گناہ نیست ریختن در نہادِ بال و پرست
نہاد، جہلت کو کہتے ہیں۔ قفس اور دام دونوں جانور کے لیے تکلیف اور اذیت کے
مقام ہیں، جہاں اکثر جانور تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے اور اس کے بال و پر گر جاتے
ہیں۔ یہاں قفس اور دام سے دنیا اور اس کی تکلیفات مراد ہیں۔ کہتا ہے کہ قفس اور
دام پر کچھ الزام نہیں ہے، بال و پر گرنے ہی کے لیے بنے ہیں اور باندھ مارنے ہی
کے لیے پیدا ہوا ہے۔
تصوّن

ریزداں برگ و این گل افشانند ہم خزاں ہم بہار در گذراست
یعنی خزاں اور بہار دونوں رفتنی ہیں؛ اُس میں پتے جھڑتے ہیں، تو اس میں پھول
جھڑتے ہیں۔
عاشقانہ

بے تو گر زلیستہ ام، سختی این درد بسنج بگذر از مرگ کہ وابستہ بہنگامے هست
یعنی موت کے لیے تو ایک وقت معین ہے، اس سے قطع نظر کر اور یہ خیال مت کر کہ اب
تک مرا کیوں نہیں، بلکہ یہ دیکھ کہ اب تک زندہ کیوں کر رہا اور کیوں کر جدائی کے رنج اور

تکلیف کو برداشت کیا۔

رندانہ

کیست در کعبہ کہ رطلے زغبیذم بخشد در گردگان طلبہ، جامہ احرارے ہست
رطل، پیانہ، شراب، نبیذ، شراب، گردگان، وہ شے جس کو گرد رکھیں۔ جامہ احرار، وہ
بن سلا کپڑا جو مناسک حج کے ختم ہونے تک حاجی پہنے رہتے ہیں۔
عاشقانہ

نہ بدرجستہ شرار و نہ بجا ماندہ رماہ سو ختم، ایک ندانم، بچہ عنوانم خست
رماہ، راکھ۔ پہلا سو ختم، لازمی۔ دوسرا سو ختم، متعدی۔ کہتا ہے، میں جل تو ضرور گیا، مگر
معلوم نہیں اس نے کس طرح مجھے جلادیا، نہ کوئل پتنگاڑا اور نہ راکھ باقی رہی۔
عاشقانہ

بادوست ہر کہ بارہ بخلوت خورد مدام داند کہ خور و کوثر و دارالسلام چیت
دوست کو خور سے، بارہ کو کوثر سے، اور غلوت کو دارالسلام یعنی جنت سے تشبیہ دی ہے۔
رندانہ

دل خستہ غمیم و بودے دواے ما باختگان حدیثِ حلال و حرام چیت
شوخی رندانہ
از کاسیہ کرام نصیب است خاک را تا از فلک نصیب کاس کرام چیت
شوخی

نیکی ز تست، از تو نخواہیم مسزکار و خود بدیم کار توایم، انتقام چیت
یعنی اگر ہم نے نیکی کی ہے تو وہ تیری ہی طرف سے ہے، اس کی اجرت ہم نہیں چاہتے۔

اور اگر ہم بد ہیں، تو تیرا فعل یعنی تیرے بنائے ہوئے ہیں، پھر سزا کس لیے ہے؟
شوخی

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت پُرسد چرا کہ زرخ سے لعل نام چیت
یعنی غالب کے گھر میں صرف ایک پُرانا خرقہ اور ایک مصحف تھا اور کچھ نہ تھا۔ پس اس
نے ان کو اگر بیع نہیں دیا، تو شراب کا بھاؤ کیوں پوچھتا پھرتا ہے؟ بہم فروخت لے کے لفظ
میں یہ شوخی رکھی ہے کہ اگر دونوں کو ایک ساتھ نہ فروخت کیا ہوگا، تو شراب کی قیمت
نہ ادا ہو سکے گی۔

عاشقانہ

لطفِ خدا سے ذوقِ نشاطِ تیریدہ کافر دالے کہ با تم دوست خو گرفت
یعنی وہ کافر دل جو معشوق کے ظلم سہنے کا عادی ہو، اس کو خدا کی مہربانی میں بھی مزا
نہیں آتا۔ بظاہر یہ ایک شاعرانہ شوخی معلوم ہوتی ہے، مگر درحقیقت یہ ایک نیکٹ
ہے، جو ہواد ہوس کے کوچے میں ہمیشہ گزرتا رہتا ہے۔ بواہوس لوگ سب ذلتیں
گوارا کرتے ہیں، جدائی کے صدمے، رشک کی مین، اذلت و بے آبروی، معاشیق کی
بے التفاتی اور بے اعتنائی وغیرہ سب کچھ سہتے ہیں، مگر ہواد ہوس سے باز نہیں آتے،
اور پارسانی و عنف کا طریقہ جو باعثِ خوشنودیِ خدا ہے، اس کو اختیار نہیں کر سکتے۔
شوخی

رضویں چو شہد و شیر بن غالب حوالہ کرد بیچارہ باز داد و بے مشکبو گرفت
روزِ دیں نشا سم درست و معذور نہاد من عجی و طلق من عربی است
یعنی میں پیدا تو عجم میں ہوا ہوں اور میرا مذہب عربی ہے۔ پس اگر اصولِ مذہب سے واقف
نہ ہوں، تو مجھ کو معذور سمجھنا چاہیے۔

ترکِ فضل

نشاطِ جم طلب از آسمان نہ شوکتِ جم قدرِ مباحش زیاقتِ ابادہ گر عینی ست
دوسرا مصرع مثال ہے پہلے مصرع کے مضمون کی یعنی انگوری شراب چاہیے جس سے
جمشید کا ساعیش حاصل ہو، یا قوت کا پیالہ جس سے جمشید کی سی شاہانہ شوکت ظاہر
ہو اگر نہ میسر ہو تو نہ سہی۔

غزلیہ

ہر آنچہ در نگری جز بہ جنسِ مائل نیست عیارِ بکیسی من شرافتِ نسبی است
یعنی جس کو دیکھے اپنی جنس کی طرف مائل ہے۔ چونکہ شرافتِ نسب میں کوئی میری
مثل نہیں ہے، اس لیے میری طرف کوئی مائل نہیں، اور یہی میری بکیسی کی وجہ ہے۔
تصوّن

نشاطِ معنویاں از شرابِ بخارِ تست فسونِ بابلیاں فصلے از فسادِ تست
اس تمام غزل میں معشوقِ حقیقی کی طرف خطاب ہے۔
تصوّن

بجامِ و آئینہ حریفِ جم و سکندرِ چیت کہ ہر چہ رفت بہر عہدِ در زمانہِ تست
یعنی یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ جامِ جہاں نما جمشید کے عہد میں تھا اور آئینہ سکندر کے
عہد میں کیوں کہ جو کچھ جس زمانے میں گزرا وہ تیرے ہی زمانے میں تھا۔
تصوّن

ہم از احاطہِ تست اینکہ در جہاں مارا قدم بہ بتکدہ و سر بہ آستانہِ تست
یعنی تو جو تمام عالم پر محیط ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ہیں تو بتکدے میں، مگر ہمارا سر
تیرے آستانے پر ہے۔

تصوّن

پہرہ اتوبہ تاراج مانگا شہرہ نہ ہرچہ دُند زما بردار خزانہ آست؟
یعنی کیا یہ بات نہیں کہ جو کچھ لٹیرا ہم سے لوٹ کر لے گیا ہے، وہ تیرے خزانے میں موجود ہے؟
تصوّن

مراچہ جرم گرانڈ لیشہ آسماں پست نہ تیز گامی تو سن زتا زیادہ آست؟
اس شعر میں منہاً اپنے خیال کی بلند پروازی کا اظہار ہے اور اصل مقصد یہ ہے کہ جو کچھ ہے وہ تیری ہی طرف سے ہے۔ یعنی اگر میرا خیال اپنی حد سے تجاوز کر کے عالم بالا کے اسرار و غوامض میں دخل دیتا ہے تو میرا کیا قصور ہے؟ تیرے نازیلمنے لے گھوڑے کو تیز رفتار کر دیا ہے۔
شوخی

شباب و زندہ چہ نا قدر دلی ہستی ست بلا بجان جوانانِ پارسا ریزد

تصوّن

آخر منزلِ نخست خوی تو راہ می زند اول منزلِ دگر گویے تو زاد می دہد
یعنی سالک جب تیری راہ میں قدم رکھتا ہے اور پہلی منزلِ قریب ختم ہونے کے ہوتی ہے، تو سخت سخت مشکلات اور امتحانات کا سامنا ہوتا ہے۔ جب یہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے اور دوسری منزل شروع ہوتی ہے، تو لذتِ قرب حاصل ہونے لگتی ہے، جوشل زار راہ کے آگے بڑھنے کی ہمت بندھ جاتی ہے۔
تصوّن

اے کہ بیدار نہم زتست او یکہ لبیدہ غم زتست نازش غم کہ ہم زتست خاطر شادی ہد
مست عطاے خود کند ساقی مانہ مست نے دارہ زیاد می برد البکہ زیاد می دہد
یعنی ہمارا ساقی شراب سے مست نہیں کرتا، بلکہ اپنی عطا و بخشش سے مست کرتا ہے۔

چوں کہ وہ ہر دفعہ پہلے سے زیادہ دیتا ہے اس لیے ہم پہلا دیا ہوا بھول جاتے ہیں؛ اس کے احسان کے لئے شراب کا نشہ غالب نہیں آنے پاتا۔

اخلاق

دلِ اسبابِ طربِ گم کردہ در بندِ غم نہاں شد زراعتِ گاہِ دہقاں می شود چوں باغِ دیں شد
یہ مضمون مرزا کے حسبِ حال ہے اور عموماً مسلمانوں کی حالت پر صادق آتا ہے۔ اول عیش و عشرت اور پھر نون تیل لکڑی کی فکر۔ زراعت اور باغ کی مثال کس قدر مثلِ ر کے مطابق واقع ہوئی ہے۔

زنا گرم است این ہنگامہ بنگرِ شورِ ہستی را قیامت می دردا ز پردہِ خاک کے کہ انساں شد
یعنی جو کچھ دنیا میں فتنے اور فساد اور جنگ و جدال اور شور و غوغا ہے، وہ انسان ہی کے دم سے ہے۔ اگر حضرت انسان نہ ہوتے تو تمام عالم میں سناٹا ہوتا۔

قضا از ذوقِ معنی شیرِ می رخت در جانہا نئے از لالے پالایشِ چاہِ آبِ حیواں شد
لالے پالا، صافی کو کہتے ہیں، باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

جلوہ اے داغ کہ ز دمِ زمک می خیزد مژدہ اے درد کہ شگم ز دوا می آید
یعنی اے داغ اب تیرے ظاہر ہونے کا وقت آگیا کیوں کہ تمک جو تیرے طول پکڑنے اور ترقی پانے کا باعث ہے، مجھے اس میں مزا آنے لگا ہے اور اے درد تیری بن آئی ہے کیوں کہ مجھے دوا سے ننگ آنے لگا ہے۔

نصوف

بمچو رازے کہ بستی ز دل آید بربو در بہاراں ہمہ بویت ز صبا می آید
اس شعر میں معشوق حقیقی کی طرف خطاب ہے اور اس حدیث کے مضمون کی طرف اشارہ ہے کہ **إِنَّ اللَّهَ فِي آيَاتِهِ ذِكْرٌ لِّمَنْ أَنْفَعَهُ فَمَنْ أَتَى اللَّهَ بِحَرْمٍ لَّيْسَ مِنَ الْخَالِقِينَ**۔

آزادی

خوش است آنکہ با خویش جزم ندارد دلے خوشتر است آنکہ این ہم ندارد

عشق

سر ابے کہ رخشد بوی را، خوشتر ز چشے کہ پیرایہ نم ندارد
یعنی وہ سراب جو صحراییں چمکے، اُس آنکھ سے بہتر ہے جو تر نہیں ہے۔
شوخی۔

سخن نیست در لطفِ این قطره غائب بہشتے بود مہد کا دم ندارد
قطرے سے مراد قطرہ زمین ہے۔
تصویر

مژدہ صبح دیدیں تیرہ شبانم دادند شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند
سرخ کشودند و لب ہرزہ سرایم بستند دل ربودند و دو چشم نگراںم دادند
فخریہ

سوخت آتشکدہ، ز آتشِ نفسم بجشیدند ریخت بتخانہ ز ناتوس فنا نم دادند
گہ از رایتِ شاہانِ عجم برچیدند بعوضِ خامہ گنجینہ فنا نم دادند
افسر از تارکِ ترکانِ پشتگی بُردند بہ سخنِ ناصیہ، حکیمانم دادند
گوہر از تاجِ گستند و بدانش بستند ہرچہ بُردند بہ پیدا، بہ نہانم دادند
رندانہ

رندانہ

ہرچہ در جزیرہ ز گہراں می ناب آوردند شبِ جمعہ، ماہِ رمضانم دادند

زارتالی

ہرچہ از دستگیرِ پارس بہ یعنا بُردند تا بنا لم ہم لزاں جلد ز بانم دادند
اخیر کے چھ شعروں میں اس بات کا بیان ہے کہ قضا و قدر نے جو کچھ عرب کی فتوحات کے

اپنے اعز و نفس کا اظہار ہے۔ یعنی عزت کے ساتھ مجھے قید کرو، تو مجھے قید ہونے سے کچھ
 انکار نہیں ہے۔ پس یہ اُمید نہ رکھو کہ میں دانے کی لالچ سے جال میں آ پھنسوں گا، نہیں،
 بلکہ نفس کو اتنا اونچا کرو کہ میرے گھونسلے تک پہنچ جائے، میں نفس میں خود اچلا آؤں گا۔
 عاشقانہ

تیر نخست را غلط انداز گفت ام اے واسے گرنہ تیر در گریز نشان رسد
 غلط انداز اس تیر کو کہتے ہیں، جو خطا کر کے غیر مقصود جگہ جا لگے۔ چوں کہ عشاق معشوق
 کے تیر کے مشتاق ہوتے ہیں اس لیے کہتا ہے کہ ایک تیر تو اس کا آکر لگا ہے، مگر میں
 اس کو اپنی نحوست طالع کے خیال سے غلط انداز سمجھتا ہوں۔ اب اگر دوسرا تیر بھی
 اسی جگہ آکر لگا، تو میں سمجھوں گا کہ پہلا بھی ارادے سے لگایا گیا تھا، ورنہ میرا خیال
 جو پہلے تیر کی نسبت تھا، صحیح ہو جائے گا اور اُمید بالکل باقی نہ رہے گی۔
 رندانہ

اُمید غلبہ نیست، بہ کیشِ مغاں در آئے مے گریہ حزیہ دستِ نزارِ مغاں رسد
 یعنی اگر پارسیوں پر غلبہ اور حکومت حاصل ہونے کی امید نہیں ہے، تو ان کا مذہب اختیار
 کر لے کیوں کہ اس صورت میں اگر شرابِ جزئیے میں نہ آوے گی، تو ہدیہ اور سوغات میں
 ضرور آوے گی۔ اس شعر میں گویا یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آتش پرستوں پر غلبہ
 واستیلا حاصل کرنے کی علت غائی یہی ہے کہ جزیہ میں شراب آیا کرے۔ پس جب
 غلبہ کی اُمید نہ ہو، تو لاچار کیشِ مغاں اختیار کرنا چاہیے، تاکہ اگر جزیہ میں نہیں تو ہدیہ و
 ارمغان ہی میں شراب وصول ہوا کرے۔

عاشقانہ

جاں بر سرِ مکتوبِ تو از شوقِ فشاندن
 از عہدہ تحریرِ جوابم بدر آورد

زارنالی

اُن کشتی بٹکتے ز موجم کہ تباہی افگند در آتش گراز آہم بدراورد
جب کشتی موج کے تھپیڑوں سے لٹ جاتی ہے، تو اس کے تختوں کو پانی سے نکال
کر آگ میں ایندھن کی جگہ جلاتے ہیں۔ اپنے تئیں کہتا ہے کہ میری مثال بھی اُسی کشتی کی
سی ہے کہ ڈوبنے سے بچا تو آگ میں جھونکا گیا۔
تصوف

گر جلوہ رخ تو بہ ساغرِ نیدہ اکیم چندیں بذوقِ بادہ دل از جا چہ میرد

زارنالی

ہفت آسیا بگردش و مادر میانِ او غالب! اگر میرس کہ بر ما چہ میرد

دنیا

مجاہد کی گردِ راسی کا ندیس داری چو خار از پا برآمد، پا زاماں بر نمی آید
یعنی کسی حالت میں بھی آدمی دنیا کے مخصوص سے نجات نہیں پاسکتا۔ اگر کاٹا پاؤں سے
نکل گیا تو پاؤں دامن میں الجھے گا۔
ترک بحثِ حلال

برآر از بزمِ بحثِ اے جذ بہ توفیقِ اغیار کہ ترکِ سادہ ما با فقیہاں بر نمی آید
ترکِ سادہ یعنی غالب جو کہ ایک بھولا بھالا ترک ہے۔ یہ ایسی ترکیب ہے جیسے موسے
من اور فریادِ من معنی خود میں۔ "با فقیہاں بر نمی آید" یعنی مولویوں کی دلیلیں اور
جھٹوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ "با کسے بر نیامدن" کے معنی ہیں اس سے سربر
اور عہدہ برآ نہ ہوا۔
تصوف

چشمِ دل با ختم، دادِ ہنر خواہد داد آنکہ چوں من ہمدانِ ہمہ بین تو شود

یعنی چوں کہ میرے دل نے تجھ کو جانا ہے، جیسا کہ تو ہے، اور میری آنکھ نے تجھ کو دیکھا ہے، جیسا کہ تو ہے، اس لیے دل اور آنکھ دونوں کو کھو بیٹھا ہوں۔ پس میرے اس کام کی داد وہی دے گا، جو میری طرح تیرا ہمہ دال و ہمہ بین ہوگا
تصوف

کھرو دیں چیت جزا لائش پندارِ جود پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دین تو شود
عاشقانہ

رفتہ بودی و گراز جا بہ سخن سازی غیر منت از نخت کہ خاموشی ما یاد آمد
یعنی تو نے رقیب کی سخن سازی سے پھر دھوکا کھایا تھا، مگر شکر ہے کہ اس کی سخن سازی دیکھ کر ہماری خاموشی تجھ کو یاد آگئی جس سے تجھ کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ سچے عاشق نہ سے کچھ نہیں کہا کرتے۔
عاشقانہ

دش گز گردشِ ختم گلہ برد تو بود چشم سُوے فلک روی سخن سُوے تو بود
یعنی نصیب کی گردش کا گلہ کرتے وقت آنکھ آسمان کی طرف تھی اور باتیں تجھ سے کر رہا تھا۔ ایک خاص حالت کی تصویر بہت عمدہ لفظوں میں کھینچی ہے۔
عاشقانہ

دوست دارم گر ہے را کہ بکارم ز دہ اند کایں ہانست کہ پیوستہ درابر و تو بود
تصوف

گر چنین ناز تو آما دہ یعنی مانند بہ سکند نہ یہد ہر چہ ز دارا ماند
محبوب حقیقی کی طرف خطاب ہے، سکند سے مراد بادشاہ فاتح، اور دارا سے بادشاہ مفتوح۔
تصوف

ہم بہ بودے تو خورشید پرستم، آری دل نہ مجنوں بردا ہو کہ بہ لیلہ ماند

یعنی اگر میں آفتاب کی پرستش کروں، تو وہ بھی درحقیقت تیری ہی پرستش ہے ایسے
مجنوں ہر نوں پر اس لیے فریفتہ تھا کہ ان کی آنکھیں لیلیٰ سے مشابہ تھیں۔

ماشقانہ

شکوہ دوست دشمن نہ تو غم پوشیدہ گر غم ہجر چنیں حوصلہ فرسا ماند
یعنی اگر جدائی کا غم اسی طرح بے صبر کرنے والا رہا، تو دوست کا شکوہ ضبط نہ کیا جاسکے
لگایا یہاں تک کہ اس کو دشمنوں سے بھی نہ چھپا سکوں گا۔

مُصِیبت

د لعلِ دشنہ نہاں سا خیرِ غما امروز مگر ازید کہ ماتم زدہ تنہا ماند

تصوف

بستہ جرّاء آبے بسکندہ در یوزہ گر میکدہ صہبا بہ کدو برد
یعنی سکندر کو ایک بے حقیقت پانی کے گھونٹ سے محروم رکھا اور بے کدے کا فقیر
شراب جیسی نایاب چیز کا تو نہا بھر کر دے گیا۔ مطلب یہ کہ بادشاہوں کو وہ دولت نصیب
نہیں جو بے کدے یعنی خانقاہ کے ادنیٰ گداؤں کو نصیب ہے۔

تصوف

یک گریہ پس از ضبطِ دو صد گریہ رضادہ تا بلخی آں زہر تو انم بہ گلو برد
یعنی جب دوسو دفعہ رونے کو ضبط کروں، تو ایک دفعہ تو رونے کی اجازت دے
تاکہ اس ضبط کے زہر کی کڑواہٹ ایک دفعہ رو کر صلت سے دور کروں۔

ماشقانہ

ز جوشِ شکوہ بیدارِ دوست می ترسم مباد مہرِ سکوت از دہن فرو ریزد
ایک معقول بات کو محسوس نہ کر کے لباس میں ظاہر کرتا ہے۔ مطلب تو یہ ہے کہ اس کے
شکوے نے اس قدر بے اجوا ہوں کہ شاید اس کو ضبط نہ کر سکوں، مگر اس کو اس طرح

بیان کرتا ہے کہ اس کی بیدار کا شکوہ دل سے اس جوش کے ساتھ اُبلتا ہے کہ منہ پر جو مہر سکوت لگی ہوئی ہے، کہیں اس کے ریلے میں بہ نہ جائے۔
جفا کشی

بریدہ ام رہ دوری کہ گریبِ شام بجائے گردِ رواں لہزدنِ فرورد
یعنی میں نے ایسی راہ دراز طے کی ہے کہ اگر بدن کو جھاڑوں تو گرد کی جگہ جان بدن سے جھڑ جائے۔ یہ تمثیل ہے اس محنت و مشقت کی جو فکرِ شعرا و تکمیلِ فنِ سخن میں قائل نے کی ہے۔

ماشقانہ

مکن پریشم از شکوہ منع کایں خویت کہ خود ز خم دم دوختنِ فرورد
عجیب و غریب تشبیہ اور نہایت عمدہ خیال ہے، اور نرا خیال ہی نہیں، بلکہ نیکٹ ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب محشوق مہربان ہو کر عاشق کی پریشش حال کرتا ہے تو اس وقت عاشق مہجور کا دل بھرتا ہے اور وہ شکایت کرنی شروع کرتا ہے۔ پس کہتا ہے کہ تو میری پریشش حال کے وقت شکایت سے مجھ کو منع نہ کر کیوں کہ تو جو پریشش حال کرتا ہے تو مجھ یا میرے زخم میں ٹانگے لگاتا ہے، اور ٹانگے لگاتے وقت کسی قدر خون کا ٹپکنا ضروری ہے۔ پس یہ شکایت وہ خون ہے، جو زخم کے سیتے وقت ٹپکا کرتا ہے۔
سفر

اگر بہ دل نہ غلہ ہر چہ از نظر گزرد زبے روانی عمرے کہ در سفر گنجد
یعنی عمر کا سفر میں گزرنا نہایت عمدہ ہے، بشرطیکہ سفر میں جو کچھ نظر سے گزرے اس پر انسان فریفتہ نہ ہو جایا کرے۔

ماشقانہ

بوصلِ لطف بہ اندازہٴ تمہل کن کہ مرگ تشنہ بود آبِ چوں ز سر گزرد

کہتا ہے کہ وصل کی حالت میں مہربانی اس قدر زیادہ نہ کر کہ میں اس کی خوشی کا تحمل نہ کر سکوں اور خوشی کے مارے مر جاؤں، کیوں کہ پیاسے کے لیے وہ پانی موت ہے، جو سر سے گزر جائے۔

تصوف

ہر کجاوشہ شوق تو جرات بارد جز خراشے بہ جگر گوشہ ادہم نرسد
طوبیٰ فیض تو ہر جا گل و بار افشانند جز نیسے بہ پرستش گہ مریم نرسد
جگر گوشہ ادہم یعنی ابراہیم بن ادہم، کوان زخموں سے جو تیرے شوق کی پھری برساقی ہے، ایک خراش سے زیادہ نہیں پہنچی اور جو پھول اور پھل تیرے فیض کے طوبیٰ سے جھڑتے ہیں ان میں سے صرف ایک ہوا کا جھونکا محراب مریم تک پہنچا ہے۔
شونی

مے بہ زیاد کن عرض کہ میں جو ہر ناب پیش میں قوم بہ شور اب از زمزم نرسد
خواجہ فردوس بہ میراث متنا دارد وائے گرد و روش نسل بہ آدم نرسد
خواجہ کا لفظ فارسی میں اکثر ایسے مقام پر بولتے ہیں جیسے طنز کے مقام پر اردو میں تیسرے شخص کے لیے آپ یا حضرت بولتے ہیں۔ کہتا ہے کہ آپ آدم کی میراث میں فردوس کے طلب کار ہیں، بڑا مزا ہوا، اگر آپ کا سلسلہ نسب آدم تک نہ پہنچے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کے اخلاق و عادات انسانیت سے اس قدر بعید ہیں کہ ممکن ہے آدم کی نسل سے نہ ہوں۔

تصوف

جان و غمت نشانند نگر از قفا ندارد تن در بلا ننگدن نیم بلا ندارد

ماشقانہ

چوں لعل تست غنچہ، اما سخن نداند چوں چشم تست نرگس، اما حیا ندارد

نایابی دوا

فارغ کسیک دل با درد و اگر زارد
کشت جهان سراسر دارد گیاندارد

شونی

باید زے ہر آئینہ پر مینز گفتمہ اند
آرے دروغ مصلحت آمینز گفتمہ اند

تصوف

کوفتا تا ہمہ آلالیش پندہ بُرد
از صورت جلوہ و از آئینہ زنگار بُرد

ستم لطف نما

عشوہ رحمت چرخ مخز کایں عتبار
یوسف از چاہ برآرد کہ بہ بازار بُرد
عشوہ خریدن دھوکا کھانا اور فریب میں آجانا۔ یعنی آسمان کی مہربانی کے دھوکے میں
نہ آنا کہ یہ عیار یوسف کو چاہ سے اس لیے نکالتا ہے کہ بازار میں لے جا کر بچولے۔

تصوف

ہر شمیے را مشائے در خور است
بوسے پیرا ہن بکنغاں می رود

زارتالی

جو ہر طبعم درخشانت، لیک
روزم اندرا برہنہاں می رود

نومیدی ما گردش ایام ندارد
روزے کہ یہ شد سحر و شام ندارد

بیقراری شوق

بلبل بچمن بنگر و پروانہ بہ محفل
شوق است کہ در وصل ہم آرام ندارد
یعنی شوق کو وصل میں بھی آرام نصیب نہیں، اسی لیے نہ بلبل کو چمن میں آرام ہے اور
نہ پروانے کو شمع کی موجودگی میں قرار ہے۔

سخن پردرد

چہ خیزد از سخن کز دردن جان نہ بود
بریدہ بود زبانی کہ خونچکان نہ بود

کہتا ہے کہ جو بات دل سے نہیں نکلتی، وہ کچھ اڑ نہیں کرتی۔ پس کئی وہ زبان ہے، جو
خونچکان یعنی دردِ دل سے بھری ہوئی نہ ہو۔
قسمت

حکیم ساقی دے تندرست من زبِد خوئی زطلِ بادہ بخشیم آئیم اگر ایں نہ بود
حکیم سے مراد خدا ہے۔ کہتا ہے کہ ساقی تو انداز سے زیادہ نہیں دیتا اور شراب یعنی
دولت دنیا نہایت نڈر ہے، مگر میں اپنی بد خوئی اور زیادہ طلبی سے شراب کھیا رہا ہوں
پاتا ہوں، تو غصے ہوتا ہوں۔
انصاف

زخویش ز تمام و فرستے طبع دارم کہ باز گردم و جز دوست ارمغان نہ بود
قاعدہ ہے کہ آدمی جب کہیں سفر کو جاتا ہے، تو وہاں سے کچھ سوغات و ہدیہ وارمغان
لے کر وطن میں واپس آتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں اپنے آپ سے تو جا چکا ہوں،
اب یہ چاہتا ہوں کہ واپس پھر کر اپنے آپ میں آؤں، تو دوست یعنی حق کے سوا کوئی
سوغات لے کر نہ آؤں۔
تصوف شوق

زمامِ ناقہ بدستِ تصرفِ شوق است بسوے قیس گرایش ز ساربان نہ بود
یعنی سیلی کا ناقہ جو قیس کی طرف چلا ہے، یہ ساربان کی طرف سے نہیں ہے، بلکہ
اس وقت اس کی باگ تصرفِ شوقِ قیس کے ہاتھ میں ہے، وہ جدھر چاہتا ہے
لے جاتا ہے۔
عاشقانہ

بتانِ شہرِ ستم پیشہ شہرِ یارِ اند کہ در ستم روشِ آموزِ روزگار اند
برند دلِ باداے کہ کس گماں نہ برد فغاںِ ز پردہ نشیناں کہ پردہ دار اند

مرزا کو کشت شناسد نے صدیقہ و باغ زہر بارہ ہوا خواہ بار بار اند
یعنی ہوا اور مینہ کچھ اسی لیے نہیں چاہتے کہ اس سے کھیتیاں اور باغ سرسبز و شاداب
ہوئے بلکہ صرف اس لیے کہ شراب پینے کا لطف بغیر بار بار کے نہیں آئے گا۔
یہ مضمون مرزا کو کہیں تلاش کرنا نہیں پڑا، بلکہ یہ خاص ان کی طبیعت کا
اقتضا تھا۔ جس مکان میں مرزا رہتے تھے اس کے دروازے پر ایک کمرہ تھا اور کمرے
کے آگے برآمدہ تھا جس کے نیچے رستہ چلتا تھا۔ یہ برآمدہ گزرگاہ سے تقریباً چار گز
اونچا ہو گا۔ ایک روز مینہ برس رہا تھا اور مرزا صاحب برآمدے میں بیٹھے ہوئے ایر و
باراں کی مدارت میں مصروف تھے۔ اس وقت عالم سرخوشی میں فرمانے لگے کہ جی چاہتا
ہے، ایسا رے کہ گلی کی رو کا پانی برآمدے تک آجائے اور میں یہیں بیٹھا بیٹھا
گلاس بھر کر پانی پیوں۔ کسی نے کہا: حضرت! برآمدے تک پانی آگیا تو شہر پہلے
ڈوب جائے گا۔ مرزا ہنس کر چپ ہو رہے۔

لذت سعی

چہ اطف رہی از آقا فارسی نیست مرو کبر، اگر راہ ایمنی دارد
عارف و فلجان کہتا ہے کہ جب تک کچھ خطرہ نہ ہو، سفر میں کچھ لطف نہیں۔ پس اگر کچھ
کی راہ پر امن ہے، تو کعبہ جانا نہیں چاہیے۔ فی الحقیقہ جو لوگ نہایت کٹھن منہ نہیں طے
کر کے مقام مقصود تک پہنچتے تھے، جو خوشی ان کو منزل پر پہنچنے سے ہوتی ہو گی،
اُس کا سوا حصہ بھی ان لوگوں کو حاصل نہیں ہوتی جو ریل اور اسٹیم میں تاج کل
سفر کرتے ہیں۔

ناشناسانی انساے زماں

بیاورید گر اس جا بود زباں دانے غریب شہم سخنہائے گفتنی دارد
مد سے زیادہ بلند شعر ہے۔ اگرچہ مضمون عام ہے مگر خود شاعر کے حال پر خوب چسپاں

ہوتا ہے اور اس نے یقیناً اپنی ہی نسبت کہا ہے۔ جب کوئی غیر ملک کا مسافر شہر میں وارد ہوتا ہے اور اس کی زبان کوئی نہیں سمجھتا تو ترجمان کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعر کچھ تو اس لیے کہ کسی کو اپنا قدر دان اور پایہ شناس نہیں پاتا اور کچھ اس لیے کہ اپنے نازک اور باریک خیالات کا سمجھنے والا کسی کو نہیں دیکھتا اپنے تئیں غریب شہر یعنی شہر میں بالکل اجنبی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ کسی ترجمان کو بلاؤ کہ اجنبی مسافر کچھ باتیں، جو کہنے ہی کے لائق ہیں، کہنی چاہتا ہے

عاشقانہ

ہیشم ازاں پیرس کہ پرسی واپل کوے
گونیند خستہ زحمت خود زیں دیار برد
نازم فریب صلح کہ غلب ز کوے تو
ناکام رفت و خاطر امید وار برد

رندانہ

ہر کرارخت نمازے نبود از نیمے
جائے در حلقہ رندان تصح نش مبار
جامہ یارخت کاٹھنی نہ ہونا اُس کے آلودہ ہونے کو کہتے ہیں۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

رندانہ

مغیال را بارہ عزیزست، مرزید بچاک
جوش از پردہ دگر خون سیاوش مبار
دوسرے مصرع کی تقدیر عبارت یوں ہے: مبار خون سیاوش، دیگر از پردہ جوشد
سیاوش کا قصہ مشہور ہے کہ وہ بے گناہ اپنے سسرے افراسیاب کے ہاتھ سے مارا گیا تھا، اور اس کے خون کے دباں میں تمام ملک کشت و خون میں مبتلا رہا۔ کہتا ہے کہ اے مغیو! شراب بھی بڑی عزیز چیز ہے، اس کو زمین پر مت گراؤ، ایسا نہ ہو کہ خون سیاوش پھر جوش مارے۔

شکایت چرخ

از شک کردا پنچہ بمن روزگار کرد
دخشی نشاط مرادید، خوار کرد

یہ غزل غالباً اس زمانے میں لکھی گئی ہے جب مرزا عدالت کے موافقہ سے میں پھنس گئے تھے۔ یعنی زمانے نے جب مجھ کو دیکھا کہ خستگی اور تکلیف میں بھی خوش ہے، تو مجھے ذلیل و خوار کر دیا کہ اب تو خوش نہ رہے گا۔
شکوہِ چرخ

در دل ہی ز بندش من کینہ داشت چرخ چوں دید کان نماں نماں آشکار کرد
یعنی میری دانش و بندش کے سبب مجھ سے آسمان پوشیدہ کینہ تو رکھتا ہی تھا،
اب جو دیکھا کہ وہ کینہ لوگوں پر ظاہر ہو گیا ہے، تو آسمان کھل کھیلایا اور علانیہ دشمنی کرنے لگا۔

تقدیر
لنگر گشت مرصرو کشتی شکست موج دانا خورد در یخ کہ نادان چہ کار کرد
یعنی جو کچھ ہوا وہ میری نادانی سے نہیں، بلکہ قضا و قدر کے حکم سے ہوا۔
شوخی

نومیدی از تو کفر و توراضی نہ بکفر نومیدیم دگر بہ تو امیدوار کرد
ماحصل شعر کا یہ ہے کہ درحقیقت میں ہوں تو ناامید، مگر چوں کہ تجھ سے
ہے، اور تو کفر سے راضی نہیں، اس لیے مجبوراً اپنے تئیں امیدوار بنایا ہے۔
تصوف

بشرعاً آویز و حق میجو، ز مجنوں کم نہ بارے دلش با محمل است، اما زبان با ساربان دارد
یعنی شرع سے بھی تعلق رکھو اور خدا کو بھی ڈھونڈو، آخر تو مجنوں سے کم نہیں ہے
کہ اُس کا دل تو محمل میں اٹکا ہوا ہے، مگر زبان کو ساربان سے سرنکار ہے۔ یعنی
ساربان سے باتیں کر رہا ہے اور دل لیلیٰ سے لگا ہوا ہے۔ شرع کو ساربان
سے اور حق کو محمل سے تمثیل دی ہے اور نہایت بلیغ تمثیل ہے اور شعر تو

تو اور افکار سے ہے۔

عاشقانہ

خدا را اوقت پرش نیست؛ گفتم بگذر از غالب کہ ہم جاں برب و ہم داستان ہا بر زبان دارد
 "گفتم" یعنی میں نے کہہ دیا ہے یا میں کہے دیتا ہوں کہ یہ پرستش کا وقت نہیں ہے، تو
 غالب کے حال سے دگر اور پرستش کا خیال چھوڑ دے کیوں کہ اس کی جان لیوں
 پر ہے اور داستان زبان پر، مبادا وہ اپنی درد انگیز داستان بیان کرے اور
 داستان کے ساتھ ہی اس کی جان بھی نکل جائے۔

کوینہ صغاں تو بہ کرد از کفر؛ ناداں بندہ کہ خود فروشیہاے دین بخشش زبیر دین خوش کرد
 صغان کا قصہ مشہور ہے، جو پہلے عابد تھا، پھر فسق و فجور میں مبتلا ہو گیا۔ یہاں تک
 کہ کفر تک نوبت پہنچ گئی۔ پھر متنبہ ہوا اور کفر سے توبہ کی۔ کہتا ہے کہ صغان کا کفر
 سے توبہ کرنا مشہور ہے، وہ عجب نادان بندہ ہے جس نے دین کی خود فروشی
 کے سبب خدا کی بخشش کو پسند نہ کیا، یعنی خدا کی خالص بخشش تو وہ تھی کہ
 وہ توبہ نہ کرتا، اور کفر ہی پر مرتا، اور پھر خدا اس کو بخش دیتا۔ اور اب جو وہ بخشا
 جائے گا، تو یہ بخشش دین کی قیمت ہوگی۔ پس گویا اس نے دین کی خود فروشی
 کے بھروسے پر خدا کی خالص بخشش کو پسند نہ کیا۔ "خوش کردن" کے معنی ہیں
 پسند کرنا۔

عاشقانہ

آں خود بہ بازی می برد و بد و جوی نشمرد بنمودش دین اخذہ زبیر اور مشل جان خوش نکرد
 نثری

بامن میا ویزے پدر! فرزند آذر را نگر کہ کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگان خوش نکرد
 "میا ویز" یعنی مجھ سے جگہ امت کر۔ "فرزند آذر" ابراہیم علیہ السلام۔ باقی شعر کے معنی

ظاہر ہیں۔ یہ نرا مضمون ہی نہیں ہے، بلکہ مرزا کے حسبِ حال بھی ہے، کیوں کہ جہاں تک ہم کو معلوم ہے، مرزا کے والدِ ستی المذہب اور خود مرزا اثنا عشری تھے۔
شوخی

درستم حق ناشناس گفتن، از انصاف نیست آں کہ چندین تیکہ بر علم خداوندش بود
کہتا ہے کہ اس ظالم کو حق ناشناس کہنا انصاف نہیں ہے جس کو خدا کے علم پر اس قدر بھروسہ ہے کہ اس کے بھروسے پر ظلم کیے چلا جاتا ہے اور اس کے موافقے سے نہیں رہتا
اخلاق

باخر گفتم، نشانِ اہل معنی باز گوے گفت: گفتارے کہ با کردار و بندش بود
بہر خواری لبکہ سرگرمِ تلاشم کردہ اند پارہ نزدیک در ہر دودِ ہاشم کردہ اند
”دور باش، ہٹو بچو کی آواز کو کہتے ہیں، جو بادشاہوں کی سواری کے آگے آئے
نقیب پکارتے چلتے ہیں۔ کہتا ہے کہ مجھ کو جو قضا نے سرگرمِ تلاش کیا ہے“
مقصود میرا خوار و ذلیل کرنا ہے۔ پس رافِ تلاش میں جو دھتکار مجھ پر پڑتی ہے،
اُس سے ظاہر ہے کہ میری ذلت و خواری زیادہ ہوتی ہے اور اس طرح جو امر میرے
سرگرمِ تلاش کرنے سے مقصود ہے، وہ حاصل ہوتا ہے۔ پس گویا ہر ”دور باش“
پر میں کسی قدر مقصود کے نزدیک ہوتا جاتا ہوں۔

نارنائی

چرخ ہر روزم غمِ فردا بخوردن می دہد تا قیامت فارغ از فکرِ ہاشم کردہ اند
منقبت

از چہ غالب خواجگیہاے جہان بنگِ منست گریہ با سلمان و یوزد خواجہ ہاشم کردہ اند
عاشقانہ

بخشم ناسزائی گوید و از لطفِ گفتارش گماں دارم کہ حرفِ دلشینی بعد ازیں گوید

”لطف گفتار“ کی تعریف اس سے بہتر کسی پیرایے میں نہیں ہو سکتی۔ کہتا ہے کہ معشوق فتنے میں برابر مجھ کو بڑا بھلا کہتا ہے، مگر اس کے لطف کلام سے میں ہمیشہ اسی امید میں رہتا ہوں کہ اب کوئی اچھی بات کہتا ہے، اب کوئی مہربانی کا کلام اس کی زبان سے نکلتا ہے۔

دل از پہلو روں در جہش جام خود انگار دگر بخنتے بر افشائیم، سلیمان نش نگہیں گوید اپنے دل پر فخر کرتا ہے کہ اگر اس کو پہلو سے نکال کر دکھاؤں، تو جہشید اس کو اپنا جام جہاں میں سمجھے؛ اور اگر اس کا ایک لختہ نکال کر ڈال دوں، تو سلیمان اس کو خاتم سلیمانی کا نگہیں بتائے۔

عاشقانہ

من بہ وفا مردم و رقیب بذرزد نیم لیش انگبین و نیمہ تیرزد
”بذرزد“ یعنی نکل بھاگا۔ ”تیرزد“ مصری۔ کہتا ہے کہ میں تو نباہ کرتا کرتا مر گیا، اور رقیب نکل بھاگا۔ گویا معشوق کا آدھا لب شہد تھا کہ میں اس میں پھنس کر رہ گیا اور آدھا مصری تھا کہ رقیب اس پر سے اڑ گیا۔

عاشقانہ

دعویٰ اور ابود دلیل بیہی خندہ دندان نما بجن گہرزد
کتے بڑے خیال کو کن مختصر لفظوں میں اور پھر کس صفائی اور خوبی سے ادا کیا ہے۔ کہتا ہے کہ معشوق موتی پر اس طرح ہنسا کہ اس کے دانت نظر آنے لگے۔ پس اس کا خندہ گویا اس بات کا دعویٰ ہے کہ موتی کی کچھ حقیقت میرے دانتوں کے ساتھ نہیں اور اس دعویٰ کی دلیل اس کا خندہ دندان نما ہے کیوں کہ اس کے دانتوں کا سب پر ظاہر ہو جانا یہی اس بات کی دلیل ہے کہ موتی اس کے دانتوں کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ پس اس کے دعوے کی دلیل نہایت بیہی اور ظاہر ہے

شکوہ چرخ

نہم جبیں بدش آستان بگرداند
نشینش بہ سررہ عناں بگرداند
آستان بگرداند یعنی چو کھٹ کے پتھر کو آلت کر اوپر کا رخ نیچے اور نیچے کا رخ
اوپر کر دیتا ہے۔

امتحان الہی

تو نالی از غلہ خار و تنگری کہ سپر
برو بہ شادی و اندوہ دل منہ کہ قضا
پزیردا بہ بساطِ خلیفہ بنشانند
میر حسین علی برسناں بگرداند
چوقرہ بر قضا استحاں بگرداند
کلیم را بہ لباسِ شبیاں بگرداند

نصرت

تبعث زرق تا بہ کلوم رسیدہ باد
شوخی ز حد گذشت زیا تم بریدہ باد
اول یہ آرزو کرتا ہے کہ تیری تلوار میرے سر پر پڑے اور حلق تک اتر جائے۔ پھر یہ
سمجھ کر کہ یہ مرتبہ ہر شخص کو نصیب نہیں ہو سکتا کہتا ہے کہ گستاخی حد سے گزر گئی،
میری زباں قلم ہو جو۔

عاشقانہ

گرفتہ ام زگوئے تو، آساں نہ رفتہ ام
ذریقت ہمہ می بغتاں! بگذرم ز رشک
ایں قصہ از زبانِ عزیزاں شنیدہ باد
خار بہت بیای عزیزاں خلیدہ باد
یعنی اگرچہ تیرے عشق میں کسی دوسرے کی شرکت گوارا نہیں مگر چونکہ کئی آدمیوں کے
مل کر نالہ و فریاد کرنے میں عجب لطف ہے، اس لیے میں رشک سے قطع نظر کرتا ہوں
اور کہتا ہوں: خار بہت پیاسے عزیزاں خلیدہ باد

عاشقانہ

دنیغ زدن مشت بسیار نہادند
بردند سر از دوش و سیکہ ڈل نکردند

یعنی تلوار سے سرائی کر بھی معشوق نے سبکے دس نہ کیا! پہلے سر کا بوجھ تھا اب اس جہان کا بوجھ ہے کہ اپنی تلوار سے یہ بے قدر سرائی رہے۔
وہماتے وہماتے

ہونے کہ بے زور وہ بے شور ہفتہ اندیشہ بکارِ خرد و ہوشِ کردند
یعنی شراب کا نشہ اور نے کی آواز کا درد، دونوں عقل و ہوش کے دشمن ہیں پس
جب کارکنانِ قضا و قدر نے شراب میں زور اور نے میں شور و دعوت کیا تھا، اس
وقت عقل و ہوش کے انجام کا کچھ خیال نہیں کیا۔
تصویر

کاجرِ شوقِ دیاں رہ تجارت نہ رود کہ رہ انجامِ دوسرا یہ بغارت نہ رود
یعنی شوقِ الہی کا تا جہ اس رستے سے نہیں چلتا کہ جو رستہ چلتے چلتے ختم ہو جائے
اور اس رستے میں سرائی ٹوٹا نہ جائے۔
تصویر

مرتبشاس کہ ہر نکتہ ادا لے دارد محرم آن ست کہ رہ جز بشارتِ زود
کہتا ہے کہ ہر نکتہ یعنی ہر چیز کی مرز کو سمجھنا چاہیے، کیوں کہ محرم از وہی شخص ہے
جو بغیر اُدھر کے اشارے کے ایک قدم نہیں اٹھاتا۔ یعنی جو کچھ نیچر سکھاتی ہے اس
کے، وافق عمل کرتا ہے، اکھاٹے میں اپنے میں، سونے میں، جاتے میں، غرض کہ
ہر کام اور ہر چیز میں نیچر کی ہدایت کے بغیر کچھ نہیں کرتا۔
شوقی

زائد از حوزہ ہستی بجز اس ہستاسد کہ شود دستِ زو شوق و بکارتِ زود
دستِ زو شوق ہونا یعنی شوق کے زیرِ مشق ہونا۔ غلامِ مطلق یہ کہ زائد شراعت
کے تمام الفاظ سے ان کے حقیقی معنی مراد لیتا ہے اور کسی بات کو تمثیل و استعارہ

کنایہ پر محمول نہیں کرتا۔
عاشقانہ

بیا و جوشِ تنہاے دیدنم بنگر چواشک از سرِ رنگاں چکینم بنگر
کہتا ہے کہ آ، اور دیدار کی تمنا جو میرے دل میں جوش مار رہی ہے اس کو دیکھ !
اور پلکوں کے رستے سے آنسو کی طرح میرا پکنا ملاحظہ کر۔ جوشِ تنہاے دیدار
کی تصویر اس سے بہتر غالباً کسی نے نہ کھینچی ہوگی کہ "میں آنسو کی طرح پلکوں
کے رستے سے پکا جاتا ہوں۔"
تصویر

زمین بجرم طہیدن کنارہ می کردی بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر
تصویر

دمیدانہ و بالید و آشیاں کہ شد در انتظارِ تہا دام چیدنم بنگر
کہتا ہے کہ تہا کے انتظار میں میرا دام بچھانا تو دیکھو۔ جو دانہ جال کے نیچے تہا کے
پھنسانے کے لیے ڈالا تھا، وہ آگاہ اور بڑھا اور یہاں تک بڑھا کہ اس میں گھونٹ
بن گئے، مگر تہا ہی دام میں نہ آیا۔
غزل مسلسل عاشقانہ و زندانہ

اے ذوقِ ناسخی! بازم بخروشِ آور غوغائے شبنخونے بر بنگہ ہوش آور
گر خود بچہد از سر از دیدہ فرو بارم دل خوان کن و آن خوان دیدہ بچش آور
ہاں ہدمِ فرزانہ ادانی رو ویرانہ شمع کہ خوابہ شد از بادِ نوش آور
ویرانہ یعنی غریب خانہ جو شمع کہ ہوا سے نہ بجھے گی یعنی شراب۔

شورایہ ایر وادی تلخ رست اگر ادی از شرابِ بے من سرچشمہ نوش آور
کہتا ہے کہ میں جس وادی میں ہوں یہاں کا پانی تو تلخ ہے۔ اسے ہدمِ فرزانہ! اگر تو

فیاض ہے تو میرے لیے میرے لیے سرچشمہ نوش یعنی شراب لا۔

دام کندے داری، ہر جاگزے داری دے گزند سلطان، اذیانہ فروش اور
گر مرغ بکدوریزد، برکت نہ ورا ہی شو ورثہ بسبب بخشد، بردار و بدوش اور
کہتا ہے کہ تیرے پاس دام بھی ہیں، اور تو سب جگہ آتا جاتا بھی ہے، اگر بادشاہ
عطا کرے تو فہما، ورنہ بانیہ فروش سے لا۔ اگر مرغ (آتش پرست) یعنی بارہ فروش
تو بے میں ڈال دے، تو تو بنا ہاتھ پر رکھ اور چل دے۔ اور جو بادشاہ کھڑا بھر عنایت
کرے تو کندھے پر اٹھا اور لے آ۔

رسمی دما زینا، رامش مکداز قتل آں درو چشم انگن، ایرانیہ گوش باد
رامش، راگ۔ آں سے مراد رسمیں اور ایں سے مراد قتل

گاہے بسکدستی، از بارہ ز خویشم بر گاہے بسکدستی، از مغرب ہوش اور
گاہے بسکدستی، یعنی کبھی جلدی سے مجھ کو شراب پلا کر مد ہوش کر دے اور پھر جب
میں مست ہو جاؤں تو مجھ کو گانا سنا کر ہوشیار کر۔

غالب کہ نقائش باد، ہمپاے تو مگر ناید بارے غزلے فردے ز ایں موینہ پوش اور
ہمپاے تو یعنی ہمراہ تو۔ موینہ پوش، اونی کپڑے پہننے والا۔ مرزا جاڑے میں روئی ہا
کپڑا نہیں پہنتے تھے، اکثر اونی یا پیشینے کا چغہ کوٹ اور ٹوپی وغیرہ پہنتے تھے
عاشقانہ

یقین عشق کن و از سرگماں بر خیز بہ اشتی بنشین، یا بہ استحاں بر خیز

قصوت

چارہ سنگ گیا پیچی اے زبانہ طور ز راہ دیدہ بدلہ رود جہاں بر خیز
زبانہ، شعلہ۔ وہ تجلی جو سنگ و گیہا یعنی کوہ طور اور شعلہ ایمن پر ظاہر ہوئی تھی۔
اس کی طرف خطاب کرتا ہے کہ اے شعلہ طور! پتھر اور درخت سے جو کہ تیرے

قابل نہیں ہیں، کیوں پٹتا ہے؟ ہماری آنکھ کی راہ سے دل میں اتر اور جان سے
بھڑک اٹھ۔
عاشقانہ

عیادت است نہ پر عاشق تند خوئی چیست؟ بیا و غمزدہ بنشین و لب گزاں بر خیز
معتشوق عیادت کو آیا اور عاشق کا حال نہایت ستیم دیکھ کر بے لطف ہوا ہے اس سے
کہتا ہے کہ تو عیادت کے لیے آیا ہے رڑائی کے لیے نہیں آیا۔ پھر یہ تند خوئی اور
بد مزاجی کیسی ہے؟ یہاں آکر بے لطفی کے سوا اور کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ پس آ
اور مغموم بیٹھ، اور ہونٹ کاٹتا ہوا اٹھ۔

اخلاق

نفس چوں زبوں گردد و پورا بفرماں گیر محرم سلیمانم، نقش خاتم از من پرس
کہتا ہے کہ جب نفس مغلوب ہو گیا، پھر جن کو محکوم کر لینا آسان ہے۔ میں سلیمان کا
محرم راز ہوں، اس کی انگوٹھی پر یہی نقش کندہ تھا جس سے تمام جن اس کے محکوم تھے۔
رندانہ

بوسہ از لبانم دہ، عمر خضر از من خواہ جام نے بہ پیشم نہ عشرت جیم از من پرس
منقبت

ورد من بود غالب! یا علی بو طالب! نیست بخل با طالب! اسم اعظم از من پرس
کہتا ہے کہ میرا وظیفہ 'یا علی ابن ابی طالب' ہے، مجھ کو طالب صدق سے کچھ بخل نہیں
ہے، اسم اعظم مجھ سے پوچھ لے کہ یہی 'یا علی' اسم اعظم ہے۔
عاشقانہ

لطف بتخت ہر نگہ خشمگیں شناس
آرایش جبین شگرفان ز چہیں شناس

اخلاق

بے غم نہادِ مردِ گرامی نے شود زہارا قدرِ خاطر اندوگہیں شناس!
 زہار کے معنی یہاں ضرور بالضرور کے ہیں۔ یہ لفظ جب نہیں پڑتا ہے تو ہرگز کے معنی
 ہوتے ہیں اور جب امر پڑتا ہے تو ضرور کے معنی دیتا ہے۔

تصوف

وہ سودے متوقبت آسمان نامیدش دیدہ بر خواب پریشاں زو، جہاں نامیدش
 دنیا و مافیہا کا بیج ہونا بیان کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ ایک خیالی دھواں اٹھ کر
 شاہانہ سا بن گیا، ہم نے اس کا نام آسمان رکھ لیا اور آنکھ کو ایک پریشان خواب
 نظر آیا، اس کو جہاں سمجھ گئے۔ اسی طرح اس کے بعد کے کئی شعروں میں اسی مضمون
 کی تفصیل ہے مثلاً

تصوف

وہم خاک کے رخت در شمع بیاہدیش قطرہ بگداخت، بحر بیکراں نامیدش
 باد دامن ز در آتش نو بہاراں خواندش داغ گشت آن شعلہ از مستی، خزل نامیدش
 چوں کہ نو بہار میں تمام جذباتِ نفسانی جوش میں آتے ہیں، اور عشق و ہوس کی
 تحریک ہوتی ہے اس لیے بہار کو آگ سے تشبیہ دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہوا نے
 آگ کو دامن سے سلگایا، میں نے اس کو بہار قرار دے دیا۔ اور جب وہ شعلہ
 جل بجھا، تو میں نے اس کا خزاں نام رکھ دیا۔

تعریف: اہلِ دین

غربتم ناسازگار آمد، وطن فہمیدش کرد تنگی حلقہ دام، آشیاں نامیدش
 کہتا ہے کہ جب پردیس میں مجھے تکلیفیں پہنچنے لگیں تو میں اس کو وطن سمجھا، گویا
 جب دام کے حلقے نے تنگی کی، تو میں اس کو اپنا آشیانہ سمجھ گیا۔ مطلب یہ کہ وطن

میں اس قدر بے مہری اور مغائرت دیکھی تھی کہ جب پردیس مجھ کو اس نہ آیا تو میں نے اس کو بھی وطن ہی تصور کر لیا۔

عاشقانہ

بود در پہلو بہ تمکینے کر دل سے گفتش رفت از شوخی بآینے کہ جاں نامید مش یہاں بوز کی ضمیر معشوق کی طرف راجح ہے۔ کہتا ہے کہ وہ میرے پہلو میں ایسی تمکین کے ساتھ بیٹھا تھا، جس طرح پہلو میں دل رہتا ہے؛ اور وہ شوخی سے اٹھ کر اس طرح چلا گیا کہ میں اس کو جان کہ اٹھا۔ یعنی جو جان کے جانے سے کیفیت ہوتی ہے، وہی اُس کے جانے سے ہوئی۔

عاشقانہ

دل زبان راز دانِ آشنا نہیں خواست در سلوک از ہر چہ پیش آمد گزشتن و اشم دل در غمش بسوزا کہ جاں می دہد عوض نبود سخن سرائی ما انگاں کہ دوست کہتا ہے کہ یہ سخن سرائی ہم کو مفت نہیں ملی ہے، بلکہ دوست جب دل لے لیتا ہے تو اس کے عوض زبان عنایت کرتا ہے۔ زبان کو داں کا عوض قرار دینے میں شاعر نے لطافت یہ رکھی ہے کہ فی الحقیقت جب تک انسان کہیں دل نہیں دیتا اور عاشق نہیں ہوتا، تب تک زبان میں گرمی اور شعلہ بیانی پیدا نہیں ہو سکتی، خواہ عشق مجازی ہو، خواہ عشق حقیقی۔

یہاں اور فلاں دونوں میں یکدیگر نہیں لینا ہوتا تو وہاں۔ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اردو میں ایسے موقع پردہ یا وہ شخص یا ایسا ڈھکا بولتے ہیں۔

رندانہ

مرا کہ بادہ ندارد از روزگار چہ حظ
تر کہ هست و نیشامی از بہار چہ حظ
خوش است کوثر و پاکست بادہ کردوست
ازاں حقیق مقدس دریں خمار چہ حظ

تصوّن

چمن پراز گل و نسرين و دلربائيست
بدشت فتنه ازیں گردیلے سوار چہ حظ
چمن پراز گل و نسرين سے مراد دنیا ہے، اور دلربا سے مراد وہ ذاتِ بے نشان
ہے جو دید و دریافت سے باہر ہے۔ کہتا ہے کہ اس فتنہ خیز دشت یعنی دنیا
میں جہاں قدم قدم پر راہزن اور قزاق گھات میں لگے ہوئے ہیں، اس گرد
بے سوار سے کیا مدد پہنچ سکتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب راہ میں مسافر کو خطرہ
ہوتا ہے اور اس کی کمک کے لیے کوئی سوار آتا ہے، تو اول گرد نظر آتی ہے،
پھر سوار نمودار ہوتا ہے، مگر اس دشت میں گرد یعنی آثار و علامات تو سب موجود ہیں،
مگر سوار کا کہیں پتہ نہیں۔

تصوّن

چنیں کہ نخل بلند است و سنگ ناپیدا
زمیوہ تانہ فتنہ خود ز شاخسار چہ حظ
یعنی جب کہ نخل اس قدر بلند ہے اور پھل جھاڑنے کے لیے پھر ناپید ہیں، تو جب
تنگ میوہ خود درخت سے نہ گرے یعنی جب تک جاذبہ عنایت ہم کو خود اپنی طرف
نہ کھینچے اور شاید حقیقی خود اپنی جھلکی نہ دکھائے، ہم کو کیا فائدہ؟
شکایت

نہ مراد دولت دنیا نہ مرا جبرِ جمیل
نہ چو مزود توانا نہ شکلیا چو غلیل
فکر عقبہ!

میتہ و بار بے شبگیر در انگندہ براہ
آنکہ دانست سرا سیمکی صبح رحیل

بہنو و بار، ساز و سامان، شبگیر، پھیلی رات۔ یعنی جو شخص یہ جانتا ہے کہ کوچ کی صبح کو
کیسی گھبراہٹ اور کھلبلی پڑتی ہے وہ رات ہی سے تمام ساز و سامان باندھ جوڑ کر
رستے کے سرے پر ڈال دیتا ہے۔
رندانہ

رکنی چارہ لب خشکِ مسلمانے را اے پتر سا بچکان کردہ بے ناب سبیل
یہ خطاب ہے خدا کی طرف۔ معنی ظاہر ہیں۔
ناقدِ روانی

غالبِ سوختہ جاں را چہ بگفتار آری بیدارے کہ نداند نظیری ز قتل
ندانند نظیری ز قتل۔ یعنی نظیری اور قتل میں فرق نہیں کرتے۔
فخریہ

شعلہ چکد غم کراہ گل شکستہ ز کو؟ شمع شبستانیم ابادِ سحر گاہیم
اپنی مصیبت اور اپنی فیض رسانی اور اس پر لوگوں کی بے دردی اور ناقدرِ روانی ظاہر
کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں گویا "شمع شبستانی" ہوں کہ اس میں سے شعلے جھڑتے
ہیں، مگر کسی کو اس کے ساتھ ہمدردی نہیں؛ اور گویا میں ابادِ سحر گاہی ہوں، جو
پھول کھلاتی ہے، مگر اس کی اجرت کوئی ادا نہیں کرتا۔
شوخی

از صفِ طفلان و سنگِ شدہ بر خلق تنگ زود ز گو نگندہ کو کبہ شاہیم
یعنی میری شاہانہ سواری کو بچے سے نہیں گزرتی کیوں کہ راکوں کے ہجوم اور پتھروں کے
سمراؤ سے راہ تنگ ہو جاتی ہے۔
تصوف

جذبِ تو باید قوی کاں برد، باک نیست مگر نہ تواند رسید بخت بہ ہمارا ہم

کہتا ہے کہ تیرا جذبہ قوی چاہیے جو مجھ کو نزل تک لے جائے پس نصیب اگر میرے
ساتھ نہ چل سکے، تو کچھ حرج نہیں۔

تخریب

غالب نام آور، نامِ نشانم پیرس ہم اسد اللہم و ہم اس اللہم

ہندانہ

پر پیا علی، سراے، بادہ روانہ کردہ ایم مشرب حق گزیدہ ایم، عیشِ مُعَاذِ کردہ ایم
روانہ کردہ ایم یعنی جاری کردہ ایم۔ کہتا ہے کہ چوں کہ لبِ پریا علی، جاری ہے، اس
لحاظ سے تو ہم نے مذہبِ حق اختیار کیا ہے؛ اور چوں کہ اس پر شراب جاری ہے
اس لحاظ سے مغوں یعنی آتش پرستوں کا سا عیش کرتے ہیں۔ یعنی دین و دنیا
دونوں ہم کو حاصل ہیں۔

ندامت

بادہ بوام خوردہ و زرب قمار باختہ وہ کہ زہر چہ ناسزا ست، ہم بسزا نکردہ ایم
یعنی شراب پینا اور روپیہ ضایع کرنا تو بُرا تھا ہی، ہم نے ان برائیوں کو بھی خوبی
کے ساتھ نہ کیا۔ شراب پی تو قرض کی، اور روپیہ کھو یا تو جوئے میں۔

کتمانِ عشق

نال بلبِ شکستہ ایم، داغ بدل نہ ہمتہ ایم دولتیانِ مسکیم، زربخسزا نکردہ ایم
نال بلبِ شکستہ ایم یعنی اس کو منہ سے نہیں نکلتے دیتے اور ضبط کرتے ہیں، اور داغ
کو دل میں چھپائے رکھتے ہیں؛ ہم دولت مند تو ہیں مگر خسیس ہیں، اپنی دولت کو
خزانے میں رکھتے ہیں۔

آہوت

مگر فراموشی بفریادم رسد وقتت و تمنت رفتام از خویشتن چندانکہ دریادِ خودم

کہتا ہے کہ میں اپنے آپ سے تو گزر گیا ہوں، مگر ابھی آپے کو بھولا نہیں ہوں اگر فراموشی اس وقت میری فریاد کو پہنچے اور آپے کو بھلا بھی دے، تو بہت مناسب ہے۔
تصوف

ہر قدم لختے ز خود رفتن بود در بارِ من ہچو شمع بزم در راہِ فنا زادِ خودم
کہتا ہے کہ راہِ فنا میں جو کچھ کہ میرے بار یعنی خورجی یا زنبیل میں ہے، وہ صرف یہی ہے کہ ہر قدم پر تھوڑا تھوڑا اپنے آپ سے دور ہوتا جاتا ہوں۔ گویا جس طرح کہ شمع راہِ فنا میں آپ ہی اپنا زادِ راہ ہے کہ برابر پگھلتی جاتی ہے اور زادِ راہ کی طرح نبطنی جاتی ہے، اسی طرح میں بھی آپ اپنا زادِ راہ ہوں۔
عاشقانہ

یادِ باد آں روزِ کاراں کا عتابے داشتم آو آتشناک و چشمِ اشکبارے داشتم
جوانی کے زمانے کو یاد کرتا ہے، جب کہ بوالہوسی یا عشق و محبت زور شور پر تھا، آہ آتش ناک تھی اور آنکھ اشک بار۔

بیخودی ویکراںِ خویشم خبرِ نبودِ تکلفِ بر طرف
ایں قدرِ دائم کہ غالب نامِ یارے داشتم
عاشقانہ

ایں چشمِ سوراہ است کہ از شوقِ تو در سردارم دلِ پروانہ و تمکینِ سمن در دارم
تصوف

اں چرا در طرب و ایں ز چہرہ در تعب است خندہ بر غفلتِ درویش و تو نگہ دارم
کہتا ہے کہ میں درویش و تو نگہ دونوں کی غفلت پر ہنستا ہوں جب کہ دنیا کا طرب اور تعب دونوں پیچ ہیں، تو ایک خوش کیوں ہے؟ اور دوسرا رنجیہ کیوں ہے؟

مناجات

رازدارِ تو و بدنامِ کنِ گردشِ چرخ ہم سپاس از تو دہم شکوہ ز اختر دارم
خدا سے کہتا ہے کہ جو تجھ سے تکلیف پہنچتی ہے اس کی صلاحت کو خوب سمجھتا
ہوں، مگر آسمان کو بدنام کرتا ہوں۔ پس درحقیقت تیرا احسان مند ہوں، مگر بظاہر
ستارے کا شکوہ گزار۔

عاشقانہ

خوشنودم از تو وز پے دور باش خلق آوازہ جفاے تو در عالم افکنم
کہتا ہے کہ میں نے تجھ کو جفاکار اس لیے مشہور کر رکھا ہے کہ اور کوئی تیری طرف
رغبت نہ کرے ورنہ درحقیقت میں تجھ سے ہر طرح راضی اور خوشنود ہوں۔
فقر

دو زند گریغرض زمیں را بہ آسمان عاشاگزیں فشار درابر و خم افکنم
افسوس متضمن فقر

ہم بعالم زایل عالم برکنار افتادہ ام چوں امام سجدہ بیروں از شمار افتادہ ام
زمن خدر زلزلنی، اگر لباسِ دیں دارم نہفتہ کافر ہویت در آستین دارم
اس شعر کے مصداق وہ مکار اور ریاکار لوگ ہیں، جن کو متشرع اور مقدس سمجھ کر ان
کے آگے کوئی بات ہنسی یا بے تہذیبی یا رند مشربی کی کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مگر
ان کو ذرا ٹٹول کر دیکھیے، تو وہ ٹٹئی کی اوجھل شکار کھیلنے والے نکلتے ہیں۔ اس میں
خطاب معشوق کی طرف ہے جو نو عمر ہونے کے سبب مقدس آدمیوں کی صحبت
سے بھاگتا ہے۔

شکایت

نشدہ ام بکبرانی بشا ہر اعد ہوز ہزار دزد بہر گوشہ درکامیں دارم

”ہنوز“ کا لفظ یہاں ایسا ہے جیسا اردو میں ”تاہم“ یا ”باوجود اس کے“ بولتے ہیں۔
 کہتا ہے کہ میں امیروں کی مدد سرائی کے لحاظ سے تو ایسا ہوں، جیسے شاہراہ میں
 ایک گدا بیٹھا ہو، مگر اس لحاظ سے کہ لوگ میرے مضمون چراتے ہیں، میرا یہ حال
 ہے کہ ہزاروں چوٹے میری گھات میں لگے ہوئے ہیں۔
 توقع

زود دوزخیاں رافضوں نیازند توقعے عجب از آد آتشیں دارم
 کہتا ہے کہ اہل دوزخ کو ظاہر ہے کہ میعادِ معین سے زیادہ دوزخ میں نہ رکھینگے
 پس اس خیال سے میں اپنی آواز آتشیں سے ایک عجیب توقع رکھتا ہوں، یعنی
 یہ کہ آواز آتشیں بھی ہمیشہ نہ رہے گی۔ اس توقع کو عجیب اس لیے کہا ہے کہ اس کو بھی
 دوزخ پر قیاس کر کے اس سے آخر کار نجات کا امیدوار ہے۔

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غائب! خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم
 دوسرا مصرع نظیری کا ہے جس کا اصل مصرع یہ ہے:

مرا بہ سادہ دلہاے من تو ان بخشید

نظیری کا یہ شعر بڑے رتبے کا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ مرزا نے یہ مصرع تفسیم کیا کیا
 ہے گویا اس کو چھین لیا ہے۔ مرزا کے مقطع کا مطلب اب یہ ہو گیا کہ نظیری کی
 غزل پر غزل لکھنی تھی تو خطا مگر میں نے اس پر ایسی غزل لکھی ہے کہ اپنی اس خطا
 پر آفریں کا امیدوار ہوں۔

غزل مسلسل عاشقانہ

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم قضا بگردش رطل گراں بگردانیم
 معشوق سے کہتا ہے کہ تو آ، تاکہ آسمان کا یہ قاعدہ کہ وہ دوست کو دوست سے
 نہیں ملنے دیتا ہم تم دونوں مل کر پلٹ دیں اور حکیم قضا کو رطل گراں یعنی جہاں شراب

کی گردش سے پھیر دیں۔

بگوشہ نشینم و در فراز کنیم
بکوچہ بر سر رہ پاسباں بگردانیم
درفراز کنیم یعنی دروازہ بند کر دیں اور چوکیدار کو حکم دیں کہ کوپے میں پھرتا رہے اور
کسی کو نہ آنے دے۔

آرزو شمن بود گیر دار تندیشم
اگر کلیم شود ہم زبان، سخن نہ کنیم
وگر خلیل شود میہ سماں بگردانیم
مے آوریم و قدح در میاں بگردانیم
بکار و بار زنے کار داں بگردانیم
گہے بوسہ زباں و در داں بگردانیم
لاب، تملق و خوشامد سخن کو ادا کے ساتھ ملانا، براؤ چاؤ اور راز و نیاز کی باتیں کرنا۔

نہیم شرم بیک شو و یا ہم آویزیم
ز جوش سبز سحر انفس فرو بندیم
یعنی اختلاط کے موقع پر ہم دونوں ایسے زور زور سے سانس لیں کہ صبح کا دم بند کر دیں
اور اس کو طلوع نہ ہونے دیں، اور دن کی گرمی کی بلا جہان سے ٹال دیں۔

بو ہم شب ہم را در غلط بیند ازیم
یعنی سب کو رات کے دھوکے میں ڈال دیں یہاں تک کہ چرواہے کو ریوڑ سمیت آدھے
رستے سے شہر کی طرف اٹا پھیر دیں

بجنگ باج ستان شاخسای در
یعنی جو لوگ درختوں سے میوہ اور فواکہ کی ڈالی لینے کو آئیں ان کو لڑکھائی کے باہر
ہی خالی جھال کے ساتھ پھیر دیں۔

بصلح بال فشانان مسجد گاہی را
ز شاخسار سوے آشیان بگردانیم

یعنی جو پرندے صبح کو گھونسلوں سے درختوں پر آکر کلیں کرتے ہیں، ان کو نرمی اور چمکار کے ساتھ گھونسلوں کی طرف لوٹا دیں۔

زحید ریم من و تو، زما عجب نہ بود گرافتاب سوے خاوراں بگردانیم
کہتا ہے کہ تم تم حیدری ہیں، ہم سے تعجب نہیں کہ جس طرح بقول بعض حیدر کرار
سے معجزہ روا شمس ہوا تھا، ہم بھی آفتاب کو مشرق کی طرف واپس پھیر دیں۔

ندامت

رفت برا آنچه خود ما خواستیم دایہ از سلطان به غوغا خواستیم
قاعدہ ہے کہ جب فقیر بادشاہ سے بھیک مانگتے وقت شور و غل کرتا ہے، تو اس کو
مار کر ہٹا دیتے ہیں اور کچھ نہیں دیتے۔ کہتا ہے کہ ہم پر جو سختی گزری، وہ خود ہم نے
اسی چاہی تھی، کیوں کہ بادشاہ سے بھیک مانگتے وقت شور و غل بہت کیا، اس لیے
وہاں سے دھتکارے گئے اور کچھ نہ ملا۔ سلطان سے مراد خدا تعالیٰ ہے۔
فخریہ

دانش و گنجینہ پنداری یکے است حق نہاں دلاں چہ پیدا خواستیم
پنداری اور گوی اور گویا کے ایک معنی ہیں۔ کہتا ہے کہ علم اور خزانہ گویا ایک ہی چیز
ہیں، کیوں کہ جو چیز ہم نے علانیہ مانگی یعنی دولت، وہ خدا نے ہم کو پوشیدہ طور پر
دی یعنی علم و ہنر۔
لکھنؤ

رفت و باز آمد ہما در دام ما باز سر زاریم و عنقا خواستیم
کہتا ہے کہ ہمارے دام میں پھنس کر نکل گیا تھا، پھر آں پھنسا، اب چاہیے
تھا کہ اس کی زیادہ نگرانی کرتے اور اس کو نکلنے نہ دیتے، مگر ہم نے اس کو خود
چھوڑ دیا اور عنقا کی خواہش کی۔ ہما سے مراد دولت دنیا، اور عنقا سے مراد حدیث ذات

آزادی

و جسے در سفر از برگِ سفر داشتہ ایم گوشہ راہ و لے بود کہ برداشتہ ایم
فخر متضمن شکوہ

داغ احسان قبولی لیلیا نش نیست نازِ خرمی بختِ ہنر داشتہ ایم
قبولی اور قبول ایک معنی میں آتا ہے۔ خرمی بختِ ہنر یعنی سرسبزی بختِ ہنر کہتا ہے کہ
ہم کو اپنے ہنر کی خوش نصیبی پر ناز ہے کیوں کہ اس پر کہینوں کی قبولیت کے احسان کا
داغ نہیں ہے۔
فخر متضمن شکایت

زخمِ جگر بخیر و مرہم نہ پسندم موجِ گہرِ جنبش و رفتار ندانم
یعنی جس طرح زخمِ جگر تک بخیر و مرہم کی رسائی نہیں ہے اور آبِ گہر کی موج میں
جنبش و رفتار نہیں ہے، ایسا ہی میرا حال ہے۔ یعنی نہ کسی کو میرے درد کی خبر
ہے، نہ میرے کمال کی اطلاع ہے۔
فخر

نقدِ فردم، سکہ سلطان نہ پذیرم جنبشِ ہنرم، گرمی بازار ندانم
شکر

غائب بود کو تہی از دوست ہانا زلفساں دہم کام کہ بسیار ندانم
یعنی وہ اس طرح حاجت روائی کرتا ہے کہ اکثر مجھ کو شعور نہیں ہوتا کہ کیوں کر یہ کام
ہن کرے۔

ذیاب کی غزل نواب مصطفیٰ خان مرحوم کے مکان پر جو مشاعرہ ہوتا تھا، اُس
میں پڑھی گئی تھی۔ چونکہ دلی کے تمام نامور شعرا کا، جو وہاں فارسی غزلیں لکھ کر لے
جاتے تھے، مرزا نے اس غزل میں ذکر کیا ہے اور غزل بھی نہایت فصیح ہے، اس

لیے بطور یادگار کے ساری غزل یہاں نقل کی جاتی ہے،
عاشقانہ

ہا پرسی چہرہ غزالان و ز مردم برم شاں
دل مردم بخم طرہ خم در خم شاں
کافرانند جہاں جوے کہ ہرگز نہ بود
طرہ حور دلاویز تر از پریم شاں
آشکارا کش بدنام و نکونامی جوے
آہ ازیں طائفہ وانکس کہ بود محرم شاں
صدق طلب

ریشک بر تشنہ تنہا رو داری دارم
نہ بر آسودہ دلائل حرم و ز مردم شاں
اخلاق

بگذر از خستہ دلانے کہ ندانی، ہشدار
خستگانند کہ دانی و نداری غم شاں
یعنی ان مصیبت زدوں کو جانے دے، جن کو تو نہیں جانتا، مگر خبردار رہ کہ بیت
سے ایسے آفت زدہ ہیں جن کو تو جانتا ہے مگر ان کا کچھ غم تجھ کو نہیں۔
بیدری اطلّیا

دلِ غ خوں گرمیِ این چادرِ گرانم، گوی
آتش است آتش، اگر پیہ و گرمیم شاں
ذکر معاہدین خود

ایکے راندی سخن از نکتہ سہرا یں مجسم
چہ بہا مدت بسیار نہی از کم شاں
ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود
باد در غلوت شاں مشک فشاں از دم شاں
مومن و نیر و صہبای و علوی و انگاہ
حسرتی اشرف و آرزوہ بودا عظم شاں
غالب ہوختہ جاں اگر چہ نیز ز د بشمار
ہست در بزم سخن ہمنفس و ہم شاں
مومن یعنی حکیم مومن خان جن کے دیوان اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں موجود

نہ یعنی نہ ہے پری چہرہ غزالان سے محبت و سہروردی سے یعنی خوش نفساں سخنورانند

ہیں نیز یعنی نواب ضیاء الدین احمد خان رئیس لوہارو جن کا کلام دونوں زبانوں میں
بقصد معتد بہ موجود ہے مگر کوئی دیوان مرتب نہیں ہوا۔ صہبائی یعنی مولانا امام بخش
جن کی نظم و نثر فارسی اور دیگر رسائل اور شروع تین جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔
علوی مولانا عبدالرشید خان علوی استاد مولانا صہبائی جن کی نظم و نثر چھپ چکی ہے،
اور عربی میں بھی ان کے قصائد موجود ہیں حسرتی، نواب محمد مصطفیٰ خان رئیس جہانگیر آباد
جن کے دیوان اردو و فارسی دونوں زبانوں میں چھپ چکے ہیں اور اس کے سوا سفر نادر
ج، تذکرہ گلشن بنیاد اور قعات فارسی بھی ان کی تصانیف سے شائع ہو چکی ہیں۔
آزاد، مولانا مفتی محمد صدیق الدین خان جن کا کلام اردو و فارسی اور عربی تینوں زبانوں
میں موجود تھا، مگر افسوس ہے کہ اس میں سے بہت کچھ ضائع ہو گیا ہے لیکن بعض
مذہبی رسالے جو ان سے یادگار رہ گئے ہیں، شائع ہو چکے ہیں۔

نثریہ

تازہ دیوانم کہ سرمست سخن خواہ شدن
کو کیم رادر عدم ادراج قبولی بوزہ است
مطلب از شعرم بہر بزنش کہ خواہ زد نوا
حرف حرفم در مذاق فتنہ ما خواہ گرفت
ایں کے از قحط خریداری کہن خواہ شدن
شہرت شعرم بہ کیتی بعد من خواہ شدن
چاکہا ایثار جیب ہر من خواہ شدن
دستگاہ ناز شیخ و برہمن خواہ شدن
کہتا ہے کہ میرا ایک ایک حرف مذاق فتنہ میں جگہ پائے گا یعنی فتنہ کو پسند آنے گا،
نہیں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ برہمن اس کو اپنے موافق سمجھے گا اور شیخ اپنے موافق
نیاں کرے گا، اور دونوں اپنی اپنی جگہ اس پر فخر کریں گے اور ایک دوسرے
کو جھٹلا میں گے اور آپس میں گل خپ ہوں گے۔

انجام شاعری

بی، چو میکویم، اگر اینست وضع زندگاں دفتر اشعار باب سو ختن خواہ شدن

اس سے پہلے بطور فخر کے کہا تھا کہ یوں ہوگا اور دُوں ہوگا؛ پھر کہتا ہے کہ ہے ہے،
میں کیا کہتا ہوں؟ اگر زمانے کا حال ایسا ہی رہا تو دفتر شعر بابِ سوختن یعنی جلا دینے
کے لائق ہو جائے گا۔

انجام شاعری

چشم کور آمیزہ دہوی بختِ خواہ گرفت دستِ شل مشاطہ زلفِ سخنِ خواہ شدن
شاہِ مضمون کہ اینک شہری جانِ ودست روستا آوارہ کام و دہنِ خواہ شدن
یعنی آئندہ یہ حال ہوگا کہ شاہِ مضمون جوابِ جانِ ودل کے شہر میں مقام رکھتا ہے،
وہ کام و دہن کے دیہات میں آوارہ ہو جائے گا۔ یعنی جن اشعار اور خیالات میں اب نہایت
دقت اور گہری نگاہ سے غور کی جاتی ہے وہ صرف لوگوں کی زبانوں پر رہ جائیں
اور ان کی تہ کو کوئی نہ پہنچے گا۔

انجام شاعری

زاعِ راغ اندر ہوائے نغمہ بال و پر زناں ہم نوائے پردہ سنجان چمنِ خواہ شدن
جنگلی کوئے (یعنی تنگ بندی کرنے والے شاعر) نغمہ سنجی کی ہوا میں پنکھ پھارے
ہوئے چمن کے نغمہ سنجوں (یعنی عالی درجہ شاعروں کی) برابری کریں گے۔

انجام دنیا

شاد باش اے دل! دریں محفلِ ہر جانِ نغمہ است شیونِ رنجِ فراقِ جانِ دتنِ خواہ شدن
اب کہتا ہے کہ دنیا میں ان باتوں کا فکر کرنا بے سود ہے؛ یہ سب نغمے موزوں ہوں
یا موزوں، ایک دن موت کے نوحے بن جائیں گے۔

انجام دنیا

ہم فروغِ شمعِ ہستی تیرگیِ خواہ گزید ہم بساطِ بزمِ مستی پر شکنِ خواہ شدن
گردِ پندارِ وجودِ از رنگِ خواہ زشت بحرِ توحیدِ عیانی موحسنِ خواہ شدن

کہتا ہے کہ ہستی کے دھوکے کا غبار جو راہ میں اٹھتا ہوا نظر آتا ہے، یہ سب بیٹھ جائے گا یعنی سب فنا ہو جائیں گے اور توحید عیانی کا دریا موجزن ہوگا یعنی ذات واحد کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا۔
ترجیح کا فریہ مسلماناں

دولت بغلط نبود از سعی، پشیاں شو کافر نتوانی شد، ناچار مسلماناں شو کہتا ہے کہ دولت یعنی سعادت کبھی غلطی نہیں کرتی، وہ اس کے پاس جاتی ہے جو اس کے لائق ہوتا ہے۔ پس تو اے مخاطب! اپنی سعی سے پشیاں ہو اور وہ دولت کیا ہے؟ کافر ہونا۔ کہتا ہے کہ تو کافر نہیں ہو سکتا، لاچار مسلماناں پر قناعت کر غائب! مرزا نے کفر سے وہ کفر مراد دیا ہے، جو صوفیہ کرام کی اصطلاح کے موافق ایک بڑا مرتبہ مراتب فقر و رویشی میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن قطع نظر ان معنوں کے، اس شعر کے ایک اور معنی نہایت لطیف و پاکیزہ زمانے کے حسبِ حال بھی ہو سکتے ہیں، جو شاید شعر کہتے وقت مرزا کے خیال میں نہ گزرے ہوں، مگر ضرور ہے کہ انھیں کے نتائج افکار میں شمار کیے جائیں کیوں کہ ٹیٹا اکثر کلام کی بنیاد ایسے جامع اور مادی الفاظ پر رکھتے ہیں کہ گو قائل کا مقصود ایک خاص معنی سے زیادہ نہ ہو مگر کلام اپنی عمومیت کے سبب بہت سے محمل رکھتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا مسلمان ہونا جس کو سارا زمانہ مسلمان کہے اور مسلمان سمجھے، یہ تو بہت آسان ہے، مگر قوم کی بھلائی کی وہ تدبیر کرنی کہ اس کی بھلائی ان کے بغیر دشوار معلوم ہو اور ان تدبیروں کے اختیار کرنے میں لوگوں کے طعن و تشنیع سے نہ ڈرتا، یہاں تک کہ یہ مذہب اور کافر مشہور ہونا، مگر قوم کی خیر اندیشی سے دست کش نہ ہونا نہایت دشوار، بلکہ بعض حالتوں میں قریب ناممکن کے ہے کہ ہزاروں اور لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں میں ایک ایسا فرد دنیا کے عجائبات میں سمجھا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ایسا کافر بننا تو بہت مشکل ہے، ناچار مسلماناں

پر گفتا کر یہ معنی کسی کے ذہن نشین کرنے نہایت مشکل تھے، مگر الحمد للہ کہ خود ہماری قوم میں سن اتفاق سے اس وقت ایک شخص موجود ہے، جس کی حالت پر نظر کرنے کے بعد اس شعر کے کوئی دوسرے معنی ان معنوں سے زیادہ چسپاں نہیں معلوم ہوتے یعنی ڈاکٹر سر سید احمد خان جس نے کافرا، ملحد، پجری، دجال، سب کچھ کہلوانا منظور کیا مگر قوم کی خیر خواہی سے دست بردار نہ ہوا۔

خطاب بہ ناقصاں

از ہرزہ رواں گشتن قلم نہ توان گشتن جوئی! یہ خیاباںِ ردِ سیلی، یہ بیاباںِ شو ہرزہ یعنی برائے نام جاری ہونے سے قلم نہیں ہوا جاتا۔ اے مخاطب! تو ایک نامی ہے، باغ کی کھارہوں میں جا، اور ایک رد ہے، جنگل کی راہ لے۔ یہ ان ناقص العیار لوگوں کی طرف خطاب ہے، جو کسی فن میں شہید حاصل کر کے اپنے تئیں کاملین کہہ شمار کرنے لگتے ہیں۔

اطاعت

گر چرخ فلک گردی، سر بر خطِ فرماں نہ در گوے زمین باشی! وقعتِ خم چو کھل شو یعنی تو کیسا ہی عالی رتبہ اور گرانمایہ ہو جائے، اطاعت و فرمانبرداری کرتی ضرور ہے چاہو اطاعت کو عام لو اور چاہو، خاص خدا کی فرماں برداری مراد رکھو کیوں کہ جس طرح دین میں بغیر خدا اور رسول کی فرماں برداری کے کام نہیں چلتا، اسی طرح دنیا میں سلاطین و ملوک اور ماں باپ اور افسر اور آقا وغیرہ کی اطاعت کے بغیر کچھ بن نہیں آتی۔

صبر و شکیب

در بندِ شکیبائی مسردم ز جگر خالی اے حوصلہ تنگی کن، اے غصہ فراواں شو کہتا ہے کہ صبر کے شکنجے میں کلیجہ مسوستا مسوستا مر گیا یعنی تھک گیا۔ اب سوا

اس کے اور کسی طرح اس بلا سے پیشکارا نہیں کہ حوصلہ تنگی کرنے لگے اور غم مردے
 بڑھ جائے۔ پس کہتا ہے کہ اے حوصلے! تو جیسا کہ اب تک فراخ اور وسیع رہا ہے،
 اب بر خلاف اس کے تنگ ہو جا، اور اے غم تو زیادہ ہو جا، تاکہ مجھ سے ضبط نہ ہو سکے
 اور کھل کھیلوں اور حکم خوری کے عذاب سے نجات پاؤں۔
 شکایت

سرمایہ کرامت کن وانگاہ بغارت۔ بر خرمین مایر قنار مزرعہ باران شو
 اگرچہ ہوتا ہمیشہ یہی ہے کہ اول سرمایہ دیتے ہیں، پھر جب چاہتے ہیں اس کو تباہ کر
 دیتے ہیں۔ مگر شاعر بطور مبالغے کے یہ جتاتا ہے کہ ہماری کھیتی پر میڈ تو کبھی نہیں براتا
 مگر خرمین پہ بجلی گراتا رہتا ہے۔ یہ انسان کی ایک قدرتی خاصیت ہے کہ مصیبتوں کے
 وقت نعمتوں کو بالکل فراموش کر دیتا ہے، اسی خاصیت پر شاعر نے شعر کی بنیاد
 رکھی ہے۔

ذیل کی غزل مسلسل اور عاشقانہ ہے، جس میں معشوق کی خصلتیں بیان کی
 ہیں اور اس کو بہادر شاہ کی تعریف اور شکایتِ ظریفانہ پر ختم کیا ہے۔ اس غزل میں
 صرف حسن بیان کا لطف ہے۔ خیالات بلند نہیں ہیں۔
 غزل مسلسل عاشقانہ

بتے دارم از اہل دل رَم گرفتہ بشوخی دل از جوشن ہم گرفتہ
 دل گرفتہ اکتا جانا یعنی اس قدر شوخ اور نازک مزاج ہے کہ اپنے آپ سے
 بھی بگڑتا ہے۔

ز سفاک گفتن چو کل رشگفتہ دریں شیوہ خودِ اسلم گرفتہ
 یعنی اگر کوئی اسے سفاک کہتا ہے، تو میرا نہیں مانتا بلکہ خوش ہوتا ہے۔ گویا
 اپنی سفاکی کو مسلم الثبوت ماننے ہوئے ہے۔

فسوں خواندہ و کار عیسیٰ نمودہ پری بودہ و خاتم از جم گرفتہ
یعنی افسوں سے معجزے کا کام لیتا ہے اور پری ہو کر جمشید کی انگوٹھی چھین لیتا ہے۔
دُش رخزہ در زبیر یوسف فکندہ غمش گندم از دستِ آدم گرفتہ
”دُم“ سے مراد بات ہے۔ دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں کہ اس کے غم میں آدم کو گندم
جیسی چیز فراموش ہو جاتی ہے۔

گہے طعنہ بر سخن مطرب سرودہ گہے خردہ بر نطق ہمد گرفتہ
بہ بیداد صد گشتہ بر ہم نہادہ باز پہ صد گونہ ماتم گرفتہ
یعنی آپ ہی کو مارتا ہے اور آپ ہی بطور کھیل کے ماتم کرتا ہے۔
برویش ز گرمی نگد تاب خوردہ بکوبیش بر فتن صبادم گرفتہ
نیارد ز من پیچ گہ یاد ہرگز مگر خوں خاقانِ اعظم گرفتہ
ظفر کز دمِ اوست در نکتہ سنجی کہ غالب بآوازہ عالم گرفتہ
یہاں دم کے معنی افسوں اور کرامت کے ہیں۔ تقدیر عبارت یوں ہے کہ غالب
در نکتہ سنجی بہ آواز عالم گرفتہ۔
غزل مسلسل در توحید

چوں زبا نہالال و جانہا پُر ز غوغا کردہ بابت از خویش پرسیدہ آنچه باما کردہ
یہ تمام غزل توحید میں ہے۔ کہتا ہے جب کہ تو نے ہماری زبانیں گونگی کر دی ہیں
اور باوجود اس کے جانوں کے اندر شورش بھردی ہے، اب تو اپنے ہی سے پوچھ
لے کہ تو نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔

گر نہ مشتاقِ عرض و سنگاہِ حسنِ خویش ”ہاں فدایت“ دیدہ از بہرِ چہ بیا کردہ
ہفت روزِ غ در نہادِ شہِ مساری مضمرت انتقام است این کہ ہا مجرم مدہا کردہ
کہتا ہے کہ شرمندگی وہ عذاب ہے جس کی نہاد یعنی ذات میں ساتوں روزِ غ چھپی

ہوئی ہیں۔ پس اگر تو نے گنہگار کے ساتھ مدارا یعنی رعایت کی اور اس کو بخش دیا، تو یہ عین انتقام ہے؛ وہ اس شرمندگی سے کہ باوجود اس قدر گناہوں کے ہم کو کچھ سزا نہیں دی، گویا سات دوزخوں میں جھونک دیا گیا۔

صد کشاد آزا کہ ہم امروز رخ بنمودہ مژدہ باد آزا کہ محور ذوقِ فردا کردہ
خستگانِ رادل یہ پر شہاے پنہاں بردہ باد رستاں گرتوا ز شہاے پیدا کردہ
”خستگان“ زخمی اور شکستہ دل لوگ۔ یعنی جن کی حالت زار بظاہر ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا ان پر خدا کا غصہ ہے۔ ”درست“ صحیح و سالم کو کہتے ہیں، ”دستان“ اس کی جمع ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کی حالت درست اور ہر ایک خستگی اور شکستگی سے محفوظ ہے، گویا ان پر خدا کی عنایت دہلانی سب سے زیادہ ہے۔ کہتا ہے کہ اگر تو نے درستوں پر ظاہری عنایتیں مبذول فرمائی ہیں، تو زخمی دلوں کو پوشیدہ مہربانیوں سے مفتوں کیا ہے۔

چشمہ نوش ست از زیر عنایتِ کامِ جاں تلخی مے در مذاقِ ماگوارا کردہ
خدا تعالیٰ کے غصے اور عتاب کو چشمہ نوش قرار دیتا ہے، اور اس کو شراب سے تشبیہ دی ہے کہ جس طرح شراب کا ذائقہ ہر شخص کو تلخ معلوم ہوتا ہے مگر شرابیوں کے مذاق میں اس سے زیادہ کوئی شے خوشگوار نہیں، اسی طرح تیرا عتاب گویا ظاہر تلخ معلوم ہوا مگر تیرے عشاق اس کو چشمہ نوش سمجھتے ہیں۔

جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہر است خویش را در پردہ خلقے تماشا کردہ
کہتا ہے کہ تو نے مخلوقات کو پیدا کر کے اس میں اپنے حسن کا آپ تماشا دیکھا ہے، تو گویا جلوہ حسن اور نظارہ عشق درحقیقت ایک ہی جنس سے ہیں۔ یعنی ناظر اور منظور ایک چیز ہیں۔

چارہ در سنگ و گیاہ درنج با جاندار بود پیش ازاں کہیں درسد آزا مبتلا کردہ

کہتا ہے کہ بیماری تو جاندار کے ساتھ مخصوص تھی، اور بیماری کا علاج سنگ و گیارہ یعنی معدنیات اور نباتات میں تھا، پس تو نے جانداروں کے پیدا کرنے سے پہلے سنگ و گیارہ کو ہٹا کر دیا، جیسا کہ علم جیولوجی میں پہاڑوں اور درختوں کا حیوان اور انسان سے پہلے پیدا ہونا ثابت کیا گیا ہے۔

دیدہ میگید، زباں می نالد و دل می تپد عقدہ باز کار غالب سر بسر واکرودہ
مقطع میں پھر اپنی عادت کے مطابق شوخی کی ہے۔ تمام ناملائم حالتوں کو جو قابل پر گزر رہی ہیں، ان کو ازراہ شوخی اور طنز کے عمدہ پیرایے میں ڈھالا ہے۔
کہتا ہے کہ آنکھ روتی ہے، زبان فریاد کرتی ہے، اور دل تڑپتا ہے۔ گویا تمام عقدے تو نے حل کر دیے ہیں۔ چوں کہ آنکھ کا رونا، زبان کا فریاد کرنا اور دل کا تڑپنا ان تینوں حالتوں میں ایک کٹایش کی صورت محسوس ہوتی ہے، اس لیے ان تمام حالتوں کو اپنے عقدوں کے حل کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ اگر اس مضمون کو شوخی پر معمول نہ کیا جائے، تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ عشق کی معراج یہی ہے کہ آنکھ روئے، زبان فریاد کرے، اور دل تڑپے۔ پس غالب پر جو یہ حالتیں طاری ہیں گویا عشق کی راہ میں جتنے عقدے تھے، وہ تو نے سب حل کر دیے۔
غزل مسلسل عاشقانہ

بالا بلندے، کو ترقبائے
چوں جان شیریں، انکٹ فائے
درد دل ستانی سرم کدائے
طاقت گدازے، صبر آزمائے
وزر وے دکش، مینو لقاے
برسم گزارے، زمزم سرائے

تا بم زد دل برد کا فرادائے
چوں مرگ ناگہ بسیار تلخ
در کام بخشی مسک امیرے
گستاخ سازے، پوزش پسندے
از خوں نافوش، دودخ نہیںے
زد دشت کیشے، آتش پرستے

برسم جعاد یا انار وغیرہ کی باشت باشت بھر کی لکڑیاں کاٹ کر آتش پرست رکھ لیتے ہیں اور عبادت یا نہلنے، یا کھانے کے وقت ان کو ہاتھ میں لے کر پڑھتے ہیں 'برسم گزار' اور 'زمزم سے' آتش پرست کو کہتے ہیں۔ زمزم اور زمزمہ وہ دعائے جو آتش پرست برسم ہاتھ میں لے کر پڑھتے ہیں۔

در کینہ و رزی، تفسید و دشتے در مہربانی، بستان سرائے

تفسید و دشت، پتا ہوا صرا۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

از زلف پر خم، مشکبیں نقابے از تابش تن زریں ردائے

یعنی زلف پر خم اس کے چہرے پر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے سیاہ نقاب منہ پر پڑی ہوئی ہو۔ اور جو کہ اوہ بدن پر ڈالتا ہے، وہ بدن کی جھک دمک سے سنہرا معلوم ہوتا ہے۔

در عرضِ دعوے، ایسے لکھو ہے بر غم غالب، مجنوں ستائے

یعنی جب دعویٰ حسن و جمال کرتا ہے، تو یلین کی ہجو کرتا ہے، اور غالب کے چہرے کو مجنوں کی تعریف کرتا ہے کہ وہ بڑا عاشق صادق تھا۔

عاشقانہ

تو کے زورِ پشیمان شدی، چہ می گوئی در دریغِ راستِ سنائی کہ داشتی، داری
یعنی تو جو یہ کہتا ہے کہ "میں ظلم سے پشیمان ہو گیا ہوں" تو کب پشیمان ہوا ہے؟
کیوں کہ وہ جھوٹ جو سچ معلوم ہوا، جیسا تو پہلے بوتا تھا، اب بھی بوتا ہے پس
تیرا یہ کہنا کہ میں ظلم سے پشیمان ہوں، یہ بھی اسی ظلم میں داخل ہے۔

عاشقانہ

بسیمنہ چوں دل و در دل چو جانِ خزیدی باز نگاہِ بہرِ فزائے کہ داشتی، داری
کہتا ہے کہ تو سینے میں دل کی طرح اور دل میں جان کی طرح بیٹھ چکا ہے، پھر بھی

تیری نگاہ ہر کا وہی حال ہے جو پہلے تھا کہ محبت کی آگ بھڑکائے ملی جاتی ہے۔
عاشقانہ

عقاب و مہر تو از ہم شناختن نتوان
خرد فریب اداے کہ داشتی، داری
شکایت روزگار

جہانیاں ز تو برگشتہ اندگر، غالب!
ترا چہ باک؟ خداے کہ داشتی، داری
تصوف

بیہودہ نیست سعی صبا دد دیارِ ما
اے بوئے گل پیام تنائے کیستی
عاشقانہ

یادش بخیر تا چہ قدر سبزہ بود
اے طرف جوئیار چمن! مجائے کیستی
و مجائے کسے سبز بودن، اس کی جگہ کا خالی رہنا۔ اور سبز ہونے کے معنی سرسبز و
شاداب ہونے کے بھی ہیں۔ طرف جوئیار، کنارہ جوئیار۔ چمن کی پٹری پر سبزہ دیکھ
کر کہتا ہے کہ اے کنارہ جوئیار چمن، تو جو اس قدر سرسبز و شاداب ہے، تو
کس کی جگہ ہے؟ کیوں کہ وہاں معشوق کو نہیں پایا، اس لیے بطور تشکون نیک
کے اول یادش بخیر کہ کر پھر سوال کرتا ہے۔

تصوف

نشید لذت تو فراموشی رود بدل
اے حرفِ محو! لعلِ شکر فلے کیستی
از بیع نقشِ غیر نکوئی ندیدہ
اے دبہ! مجو چہرہ زیباے کیستی
با بیع کافرا، این ہم سختی نہ می رود
اے شب! بزرگ من کہ تو فرداے کیستی

بزرگ من یعنی اے شب تجھ کو میری موت کی قسم چوں کہ اس وقت اپنی موت سے
زیادہ کسی چیز کو عزیز نہیں سمجھتا، اس لیے رات کو اپنی موت کی قسم دے کر پوچھتا
ہے کہ تو کس کی فرداے قیامت ہے؟ یعنی جو سختی کہ تجھ میں میرے اوپر گزر رہی ہے،

کسی کافر کے ساتھ گزرتی ہوگی۔ پھر تو کافر سے بھی بڑھ کر کون سے گنہگار کی میت کا دن ہے، بتاؤ سہی؟
 فزل مسلسل عاشقانہ

ایک گفتم: ندی دادِ دل، آرے ندی
 چشمہ نوش بہانہ تراود ز دے
 تا چو من دل بے غاں شیوہ نگاہ ندی
 کش بگیری و در اندیشہ فشاے ندی
 کہتا ہے کہ اس دل سے یقیناً چشمہ نوش نہیں ٹپک سکتا جس کو کہ تو بچھ کر قصہ میں
 فشار نہ دیوے۔ یعنی جب تک کہ دل عشق مجازی کے صدمے نہیں جھیلتا اور طرے
 طرے کی کوفت اس میں نہیں اٹھاتا اس میں صفائی اور لطافت اور گھلاوٹ پیدا
 نہیں ہوتی۔

ماہ و خورشید دیر داڑھ بیکار نیند
 اور وہ کام یہی ہے کہ عشق کے شکنجے میں دل کو فشار دیا جائے۔
 سر بردا و دم شمشیر جولنے نہ نہی
 تن بہ بندِ غم فتراک سوارے ندی
 خوں بذوقِ غم یزداں نشاے نخوری
 درں بھر حق الفت مگذا سے ندی
 یزداں نشاں اور حق الفت مگذاں، دونوں مرکب صفتیں ہیں۔ باقی شعر کے معنی
 ظاہر ہیں۔

آخر کار نہ پیدا ست؟ کہ در تن فسرد
 کفنِ خونے کہ بیاں زینتِ دارے ندی
 فسرد، فسردن کا مضارع ہے۔ فسردن، ٹھٹھیر جانا، خشک ہو جانا۔ یعنی کیا یہ بات
 ظاہر نہیں ہے کہ وہ خون جس سے تو کسی صلیب کو زنجین نہ کرے، مرنے کے بعد بدن میں
 خشک ہو کر رہ جائے گا۔

حیف مگر تن بسگانِ سر کوئے نہ صد
 دے بگر جان بسیر راہ گزارے ندی
 رہزنانِ اجل از دست تو ناگاہ برزد
 نقد ہو شے کہ بسوداے بہارے ندی

بچم طوطہ حوران بہشت آویزند تاز پروردہ دے را کہ بیامے ندہی
 گر تنزل نہ بود، ایر بہاری، غالب! کہ در افشانی و زافشانہ شمارے ندہی
 یعنی اگر اس کہنے میں تیری کسرِ شان نہ ہو، تو اسے غالب، تیری مثال ایر بہاری کی
 سی ہے کہ موتی برساتا ہے اور اس کی کنتی نہیں بتاتا، یعنی بے شمار موتی برساتا ہے۔
 تصوف

دریا ز حباب آبلہ پلے طلب تست نورِ نظر لے گوہرِ نایاب اکبائی
 شوریست نواریزی تارِ نفس را پیدائے جنبشِ مضرب اکبائی
 یعنی میرے تارِ نفس سے شعلے نکل رہے ہیں، انھوں نے ایک شور پر پا کر رکھا ہے،
 مگر اے جنبشِ مضرب کہ جس سے یہ تانج رہا ہے، تو کہاں ہے؟ تیرا کہیں پتا نہیں۔
 فوہ

بنامے یگوسالہ پرستان یدِ ریضا غالب بہ سخن صاحبِ قراب اکبائی
 و قراب، کرامت اور معجزے کو کہتے ہیں۔ گوسالہ پرستوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو ناقص العمل
 شاعرین کو ماننے میں۔
 تصوف

دیدہ و رآنکہ، تانہ دل بہ شمارِ دلبری دردِ دل سنگ بگرد، رقص بتانِ آذری
 'دیدہ و ر' یعنی صاحبِ نظر، وہ شخص ہے کہ جب اس کو یہ خیال پیدا ہو کہ دنیا میں
 کون سی چیزیں دل کش و دل ربا ہیں، تو وہ ان گھڑ پتھر کے اندر بتانِ آذری کو
 رقص کرتے ہوئے دیکھ لے یعنی مادے میں جو قابلیت اور استعدادِ خدا نے ودیعت کی ہے
 وہ پہلے اس سے کہ قوت سے فعل میں آئے، اس پر ظاہر ہو جائے۔
 تصوف

اے ٹوکہ! پیچ زدہ را، جزیرہ تو روی نیست در طلبت تو ان گرفت بادیر را بہرِ میری

یہ خطاب ہے جنابِ امدیت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جس ذرے کو دیکھیے، اس کا مزہ تیرے
 ہی رستے کی طرف پھرا ہوا ہے اور اس لیے تیری راہ طلب میں خود بادیہ یعنی صحرا
 کو اپنا رہبر بنایا جاسکتا ہے کیوں کہ اس کا ہر ذرہ تیری طرف رہنمائی کرتا ہے۔
 قصوف

یہ کہ داست در پیش داغ تو رویشِ زدل تا چو بدیگرے دہدہ باز بری بد اوری
 کہتا ہے کہ جس کے چلو میں دل ہے، اس کے دل سے تیرا داغ روئیدگی کی طرح اگتا
 ہے، اور یہ اس لیے کہ اگر وہ دل کسی اور سے لٹکے، تو اس محبت سے کہ تیری نشانی
 اس پر موجود ہے، وہاں سے اپنی چیز یعنی دل واپس لے لے۔ داور ی، جگر دہدہ
 اور حبت۔

قصوف

ر شک ملک چہ دہرا بہ چوں بتورہ نمی برد بہمدہ در ہولے تو می پرواز سبکسری
 یعنی ہم ملائکہ پر کیوں رشک کریں جب کہ وہ بھی بے فائدہ تیری تلاش میں پرواز کرتے
 سمجھتے ہیں اور تم کو شک نہیں پہنچ سکتے۔
 قصوف

دہن کہ من بخون ہم از تو خون رود کہ تو اشک بدیدہ بشری، نالہ بسینہ بگری
 یعنی آنسوؤں کہ میں تو خون میں پڑا ہوا لوٹوں اور تیرے ہی نسبت یہ کہا جائے کہ تو آنسو
 آنسوؤں کے اندر گن لیتا ہے اور فریاد کو سنے کے اندر دیکھ لیتا ہے۔
 زار زانی

کہ اگر زمین رسد خاک نورم زبے نمی طوبی اگر زمین شود، چہ کہ شمع زبے بری
 یعنی میری سونے تخت کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی شمع کو مل جائے تو اس میں نمی باقی نہ
 رہے اور مجھے اس سے خاک کے سوا کچھ حاصل نہ ہو اور اگر طوبی میری ملک ہو جائے

تو وہ ایسا بے بر ہو جائے کہ اس کی نکلڑی ایندھن کے کام آئے۔
حالت فکر شعر

بنیم از گدازِ دل، در جگر آتش چو میل غالب، اگر دم سخن رہ بفسخ من بزی
کہتا ہے کہ اگر فکر شعر کے وقت تو میری حالت درونی کو ٹھوٹے، تو دل کے گدازت
ایک آگ کی رو بہتی ہوئی تجھ کو نظر آئے۔ یہ اس جوشن اور اس آگ کا بیان ہے
جو اصلی شاعروں کے دل میں شعر کہتے وقت بھر مکتی رہتی ہے۔

مرزا کی غزلیات جو مقدار میں چار ہزار بیت سے کچھ زیادہ ہیں، اد جن میں
منتخب اور برگزیدہ اشعار ایک چوتھائی سے کم نہ ہوں گے، ان میں سے کسی قدر اشعار
جو سرسری نظر میں صاف اور عمدہ معلوم ہوئے، بطور نمونے کے یہاں نقل کرو
گئے ہیں، تاکہ جو لوگ فارسی شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں، مگر اتنا دماغ نہیں رہے د
مرزا کے کلام کو اول سے آخر تک بنظر غور دیکھیں، وہ مرزا کی غزل کا نمونہ دیکھ کر
اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ مرزا کی غزل شعراے ایران کے کون سے طبقے کی غزل
سے مناسبت رکھتی ہے؛ اور ان کی اور مرزا کی غزل میں کیا نسبت پائی جاتی ہے؟
اگرچہ مقتضائے مقام یہ تھا کہ اس موقع پر مرزا کی چند غزلوں کا موازنہ ان سب لوگوں
کی غزلوں کے ساتھ کیا جاتا جن کی غزل پر مرزا نے اپنی غزل بلکہ اپنی تمام شاعری کی
بنیاد رکھی ہے یعنی نظیری، عرفی، ظہوری، طالب وغیرہ۔ مگر چون کہ اس مختصر میں
زیادہ گنجائش نہیں، اور نیز عام طبائع کو اس قسم کی تدقیقات سے کچھ دل بستگی
بھی نہیں معلوم ہوتی، اس لیے یہاں مرزا کی صرف دو غزلوں کا مقابلہ نظیری اور
ظہوری کی غزلوں سے کہ اس وقت ان دونوں کے دیوان ہمارے پاس موجود ہیں،
کیا جاتا ہے۔

نظیری کی جو مشہور غزل پا خفتست اور بلا خفتست ہے مرزا صاحب نے بھی اس پر غزل لکھی ہے۔ نظیری کی غزل نو بیت کی ہے جس میں سے ایک شعر پڑھا نہیں گیا۔ اور مرزا کی غزل بارہ بیت کی ہے۔ اس لیے مرزا کی غزل میں سے بھی اول صرف آٹھ بیتیں لی جائیں گی، تاکہ ٹھیک ٹھیک موازنہ ہو سکے اور بعد موانے نے باقی اشعار بھی نقل کر دیے جاویں گے۔

نظیری غالب

نظر بظاہر وصیاد در خفا خفتست بوا دیے کہ دریاں خضر را عصا خفتست
 ابل رسید چہ داند، بلا کجا خفتست بسینہ می سپرم راہ گر چہ پا خفتست
 نظیری نے اس بات کو کہ عشق ایسے طور پر دفعۂ پیدا ہو جاتا ہے جس کا سان گھانا تک نہیں ہوتا، ایک معمولی حالت کے پیرایے میں جو ہمیشہ صید اور صیاد کے باہم گزرتی رہتی ہے، بیان کیا ہے۔ نظیری کا بیان، جیسا کہ ظاہر ہے، بہت صاف اور پھل ہے۔ اور گو یہ مطلع اس کے اعلیٰ درجے کے اشعار میں محسوب نہیں ہو سکتا، لیکن مرزا کے مطلع سے بہر حال بہتر ہے۔

مرزا نے گویا اپنی ناگوار زندگی کا دشوار گزار مرحلہ خوشی خوشی طے کرنے کو اس تمثیل میں بیان کیا ہے کہ جس خطرناک وادی میں حضرت خضر بھی ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں، میں وہاں سینے کے بل چلتا ہوں۔ مرزا کے اس مطلع پر ان کی زندگی میں ”عصا خفتست“ کے لفظ پر اعتراض ہوا تھا؛ مرزا نے جواب دیا کہ سعدی نے بھی تو کہا ہے:

ولے بکملہ اول عصاے پیر خفتست

مگر اس جواب کو لوگوں نے تسلیم نہیں کیا، کیوں کہ شیخ کے ہاں اس قدر قرائن موجود ہیں کہ ”عصا خفتن“ سے جو معنی اس نے بطور استعارے کے مراد رکھے ہیں، ان کے سوا دوسرے معنی کی طرف خیال ہی نہیں جاتا، بخلاف مرزا کے شعر کے کہ جب تک

یہ نہ بتایا جاوے کہ سعدی نے عصا ختن کے یہ معنی لیے ہیں، تب تک اس سے یہ معنی مفہوم نہیں ہو سکتے۔

نظیری

غالب

کجا ز عشوہ آن چشم نیم باز ریم
کہ فتنہ خاستہ از خواب پائے ما خفتست
نظیری معشوق کی اس حالت کو جب کہ وہ سوتے سے اٹھا ہوا اور آنکھیں کچھ کھلی
اور کچھ مندی ہوں اور اپنا جی اس کے سامنے سے پرے ہٹنے کو چاہتا نہ ہو، اس
طرح ادا کرتا ہے کہ فتنہ اٹھ کھڑا ہوا ہے اور ہمارا پاؤں سو گیا ہے۔ پس اس
کی چشم نیم باز کے عشوے سے کیوں کر رہائی ہوگی

مرزا مسافر کی اس حسرت ناک حالت کو جب کہ راہ بے خطر اور منزل مقصود قریب
ہو، مگر نہ مسافر میں، نہ اس کی سواری میں، آگے قدم اٹھانے کی طاقت ہو، اس طرح
بیان کرتے ہیں ”دگر زایمینی راہ الخ“ ان دونوں شعروں میں سے کسی ایک کو دوسرے
پر مطلقاً ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ جو عاشقانہ مضامین کو پسند کرتے ہیں، وہ ضرور
نظیری کے شعر کو پسند کریں گے۔ مگر اس لحاظ سے کہ مرزا کا بیان عاشق اور غیر عاشق
سب کے حالات پر حاوی ہے، اور ہر شخص جس پر ایسی حالت گزرے، اس کا مصداق
ہو سکتا ہے، یقیناً نظیری کے شعر پر فوقیت رکھتا ہے۔

نظیری

غالب

کسی بہ قلب شہم ترک تاز می آرد
کہ بر فراژ قصب پائے درخنا خفتست
نظیری کا شعر محض عاشقانہ ہے اور اس لحاظ سے کہ یہ مضمون اول اس کو سوجھا
ہے، مرزا کے شعر پر ترجیح دینے کے قابل ہے۔ کہتا ہے کہ میرے گھر پر آدھی رات

غمت بشہر شبیخوں زناں بہ بنگہ خلق

عکس بخانہ و شر در جرم سر خفتست

گئے وہ شخص اگر ڈاکا ڈالتا ہے، جو ریشمی پھونوں میں، پانوں کو منہدی لگائے پڑا سوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس کا تصور اور اس کا خیال، بغیر اس کے کہ اس کو اطلاع ہو، رات کو آکر چھاتی پر سوار ہو جاتا ہے اور راحت و آرام بالکل برباد کر دیتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ تیرا غم شہر میں لوگوں کے گھروں پر شبخون مار رہا ہے اور کوکوال اپنے گھر میں اور بادشاہ محل سرا میں چین سے پڑے سوئے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مرزا کے دل میں یہ خیال نظیری کے شعری وجہ پیدا ہوا ہے، مگر مرزا کی غیر معمولی آپک اور بلند پروازی کے لیے صرف یہی اقتباس کافی ہے کہ تھوڑے سے تصرف سے نظیری کے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ نیز مرزا کے بیان میں حقیقت و مجاز دونوں پہلو موجود ہیں اور نظیری کا بیان صرف مجازی معنی میں محدود ہے۔

غالب

نظیری

شمیم مہر زباغ و فساغی آید ہمیں زردور و محو قربِ شہ کہ منظر را
بہر چمن کہ تو بشکفتہ صبا خفتست در بچہ بازو بدروازہ اژدھا خفتست
اگرچہ نال دونوں شعروں کا واحد ہے، مگر دونوں کے بیان کا عالم الگ الگ ہے۔
نظیری اس طرح بیان کرتا ہے کہ وفائے حقیقی کے باغ سے مہر و التفات کی خوشبو
نہیں آتی، گویا جس چمن میں وہ پھول (یعنی معشوقِ حقیقی) کھلا ہوا ہے وہاں کی
صبا پڑی سوتی ہے یعنی اس کو اتہزاز مطلق نہیں ہے، جس سے اُس چمن کی خوشبو
عالم میں پھیلے۔

مرزا یوں کہتے ہیں کہ آثار و افعال کے ذریعے سے اس کو دور سے دیکھ لو، اور
”قربِ شاہ“ یعنی ذاتِ بخت کی تلاشِ مت کرو، کیوں کہ اگرچہ جھروکے کے پٹ

کھلے ہوئے ہیں (یعنی اُس کے آثار و افعال سب پر ظاہر ہیں) مگر اندر کوئی نہیں جانے پاتا، کیوں کہ عین دروازے پر اڑدھا سوتا ہے۔ اس تقریر سے ظاہر ہے کہ مال و نول کا یہ ہے کہ معرفت ذات محالات سے ہے۔ مگر ہمارے نزدیک مرزا کا بیان نظیری کے بیان سے زیادہ بلیغ اور زیادہ دلکش واقع ہوا ہے۔

نظیری

غالب

طیبِ عشق بردِ طمع زبیمارے بصبحِ حشر چنیں خستِ رُوسِیہ خیزد
کشبِ راحت ازیں دردِ بے دوا خفتست کہ در شکایتِ درد و غم دوا خفتست
نظیری کہتا ہے کہ مرضِ عشق کا طیب اُس بیمار کے علاج سے مایوس ہو جاتا ہے کہ جو کسی رات کو اس دردِ بے دوا یعنی عشق کی بے چینی سے آرام کے ساتھ سو گیا ہو، گویا مریضِ عشق کی علامت محمودی ہی ہے کہ اس کو کبھی راحت نصیب نہ ہو، مگر شولے متصفین کے اصول کے موافق نظیری کے بیان میں یہ غلط تھا کہ وہ راحت کو ردی علامت بتاتا ہے۔ حال آنکہ عاشقِ صادق کی علامت یہی ہے کہ اس کو دوست کی راہ میں درد اور تکلیف کبھی محسوس ہی نہ ہو، بلکہ ہر ایک درد اور تکلیف عینِ راحت معلوم ہو پس نظیری کے بیان سے گویا یہ لازم آتا تھا کہ عاشقِ صادق وہی ہے، جو ہمیشہ بے چینی اور بے قراری میں بسر کرے۔ اور جب ایسا ہو گا تو کبھی نہ کبھی شکایت بھی اس کی زبان سے نکلے گی۔

مرزا نے اسی لیے اس مضمون کو الٹ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ بیمارِ حشر کے دن رُوسِیہ لٹھے، جو دردِ دل کی شکایت اور دوا کی تلاش کرتا ہوا سوتا ہے۔

نظیری

غالب

کس از معانقہ روز و وصل یا بد ذوق درازیِ شبِ بیداری من اینہم نیست
کہ چند شب زہمِ آغوشِ خود جدا خفتست ز بختِ من خبر آرید تا کجا خفتست

نظیری کا شعر صاف ہے۔ کس آں کی جگہ لایا ہے۔ معانقہ و روز وصل، وہ معانقہ جو وصل کے دن عاشق و معشوق میں واقع ہو۔ شعر کا مضمون معمولی ہے، مگر الفاظ نے جان ڈال دی ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ شبِ ہجر کی درازی اور میری بیداری کا کیا خیال کرتے ہو، یہ تو کچھ بھی بات نہیں ہے۔ ہاں، یہ تلاش کرو کہ میرا نصیب کہاں پڑا سوتا ہے؟ کیوں کہ رات کی درازی، اور میری بیداری اور ایسی ایسی اور سیکڑوں مصیبتیں سب اسی کے سوجھانے سے پیدا ہوئی ہیں۔ محاکہ دونوں میں یہ ہے کہ نظیری کا شعر زیادہ نچرل اور عالی ہے، اور مرزا کے شعر میں شاعرانہ لطافت اور خوبی نظیری کے شعر سے زیادہ ہے اور کوئی بات اس میں ان نچرل بھی نہیں ہے۔

غالب

نظیری

شبِ امید پر از روزِ عید می گزرد بدیں نیاز کہ با نشت، تازی ز سدم
کہ آشنایہ تمناے آشنا خفتست گداہ سایہ دیوارِ پادشا خفتست
نظیری کا شعر اس کی تمام غزل میں بیت الغزل ہے، بلکہ اس کے سارے دیوان کے اُن ۲۷ نشتروں میں سے ایک نشت ہے، جو اساتذہ نے اس کی غزلیات میں سے انتخاب کیے ہیں۔

مرزا کا شعر گو نظیری کے شعر کی برابری نہیں کر سکتا، مگر ایسے بلند شعر پر یہ شعر نکانا مرزا ہی کا کام تھا۔ تشبیہ نہایت بلیغ اور دل نشین واقع ہوئی ہے یعنی مجھ جیسے ادنی درجے کے آدمی کو جو تیری جناب میں نیاز ہے، اس پر مجھ کو ایسا ہی تازہ ہے جیسا اس فقیر کو مہنا چاہیے جو بادشاہی محل کی دیوار کے سایے میں پڑا ہو۔

غالب

نظیری

فسادِ صورتِ نظیری مکن کہ خواب کند بخواب چوں خودم آسودہ دل بدلیں فانی
شکستہ کہ بصد درد مبتلا خفتست کہ خستہ غرقہ بخوں خفتہ است تا خفتست

نظیری کے شعور کا یہ مطلب ہے کہ نظیری کو فسانہ اس غرض سے سُنانا فضول ہے کہ ایک شکستہ و کوفتہ آدمی (نظیری) جو طرح طرح کی تکلیف میں مبتلا ہو پڑ رہا ہے، وہ سو رہے گا۔

مرزا کے شعور کا حاصل یہ ہے کہ اگر میں سو بھی جاؤں تو اسے غائب! مجھ کو اپنی طرح آسودہ اور خوشحال نہ سمجھنا، کیوں کہ بیمار (یعنی میں) جب سویا ہوں تو خون میں ڈوبا ہوا سویا ہوں۔ پس ایسے شخص کو سوتے جاگتے کیا راحت نصیب ہو سکتی ہے۔

یہاں تک دونوں غزلوں میں سے صرف آٹھ آٹھ شعر ہم نے نقل کیے ہیں اور مرزا کے آٹھ شعروہ لکھے ہیں، جو کسی کسی قدر نظیری کے اشعار سے لفظی یا معنوی مناسبت رکھتے تھے۔ اب مرزا کے باقی اشعار، جو نظیری کی غزل سے تعداد میں زیادہ ہیں، لکھتے ہیں۔

خوش خلق رندان ناز میں پسر لیست
کو سر بہ زانوے زاہد بہ بوریا خفتست
ہوا مخالف و شب تار و بحر طوناں فیز
گستہ تگر کشتی و نا خدا خفتست
دلہم بشیخ و ستجادہ و بردا لزد
کہ دزد و مرغلہ بیدار و پارا خفتست
براہ خفتن من ہر کہ بگردا داند
کہ میر قافلہ در کار و اں سرا خفتست
پہلا شعر محض رندانہ ہے، اور زبان کی گرمی اور شوخی کے سوا اور کوئی معنوی لطافت نہیں رکھتا۔ اس کے بعد کے تینوں شعر ہم نے کی رعیت کے انتخابی اشعار میں مع ہر ایک کی شرح کے لکھ آئے ہیں۔ ان میں سے پہلا شعر ہمارے نزدیک مرزا کی تمام غزل میں بیت الغزل ہے اور پچھلے دونوں شعور بھی نظیری کی غزل کے عام اشعار سے رتبے میں کم نہیں ہیں۔ پس اگر نظیری کا بہت ادب کیا جائے تو ہم اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے کہ دونوں غزلوں کو

مساوی درجے میں رکھیں! ورنہ انصاف یہی ہے کہ ہیئتِ مجموعی کے لحاظ سے مرزا کی غزل نظیری کی غزل سے یقیناً بڑھ گئی ہے۔ لیکن ایک آدھ غزل میں نظیری سے سبقت لے جانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا کی غزل کو مطلقاً نظیری کی غزل پر ترجیح دی جائے۔ نظیری وہ شخص ہے جس کی نسبت مرزا صاحب کہتے ہیں:

”صائب! چہ مجال ست شوی، ہجو نظیری
عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را“

اور مرزا بلال اسیر کہتے ہیں

ہمچشمی نظیری حدِ بشر نباشد
اور شیخ ابوالفضل آئین اکبری میں اس کی نسبت لکھتے ہیں:

دست از زہنگاہ معنی بروے کشودہ اند

پس ہماری غرض مذکورہ بالا غزلوں کے مقابلہ کرنے سے صرف اس قدر تھی کہ مرزا نے غزل میں نظیری کے تتبع کو جس درجے تک پہنچایا تھا، اس سے لوگ اچھی طرح مطلع ہو جائیں۔ ورنہ اس غزل کے سوا اور جس قدر غزلیں مرزا نے نظیری کی غزلوں پر لکھی ہیں، ان میں شاید ہی کوئی غزل ایسی ہوگی، جس میں نظیری کی غزل کا پتہ مرزا کی غزل سے غالب نہ ہو کیوں کہ اکثر پچھلے شعرا اگلوں کی انہیں غزلوں پر طبع آزمائی کرتے ہیں، جو ان کے سارے دیوان میں چیدہ و برگزیہ اور منتخب ہوتی ہیں۔ پس ایسی زمینوں میں اگلوں سے پچھلوں کا سبقت لے جانا کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔

اب ہم مرزا کی ایک غزل کا موازنہ ظہوری کی غزل کے ساتھ کرتے ہیں کہ یہ دونوں غزلیں شیخ سعدی کی اس غزل پر لکھی گئی ہیں،

شبِ فراق چہ داند کہ تا سحر چند است مگر کسیکہ بہ زندانِ عشق در بند است
اگرچہ مرزا نے ظہوری کی غزلوں پر بہت کم غزلیں لکھی ہیں، مگر چوں کہ وہ اپنے تئیں

ظہوری کا تتبع ظاہر کرتے ہیں، اس لیے اس کی ایک غزل کے ساتھ بھی مرزا کی غزل کا موازنہ کرنا ضرور تھا۔ ظہوری کا دیوان جو ہمارے پاس موجود ہے، اس میں یا تو کاتبوں کی تصحیف سے، اور یا خود ظہوری کی پیچیدہ بیانی کے سبب، اکثر اشعار کے معنی سمجھ میں نہیں آتے بہت مشکل سے صرف ایک غزل ایسی نکلی ہے جس کے ہر ایک شعر کے کچھ نہ کچھ معنی اپنی سمجھ کے موافق لگایے گئے ہیں اور اس کے تمام اشعار کا مقابلہ بعض اصحاب کی معرفت دوسرے صحیح نسخے سے بھی کر لیا گیا ہے؛ اس لیے وہی غزل موازنے کے لیے انتخاب کی گئی ہے اور چونکہ وہ شیخ کی غزل پر لکھی گئی ہے، اس واسطے یہ خیال کیا گیا ہے کہ ظہوری نے اس میں اپنی پوری طاقت صرف کی ہوگی۔ ایک اور وجہ اس غزل کی تخصیص کی یہ ہے کہ مرزا نے اپنی تمام غزل میں ایک شعر کے سوا تمام اشعار میں وہی قافیہ باندھے ہیں، جو ظہوری کے ہاں بندھے ہوئے تھے؛ اور نیز دونوں غزلیں ابیات کی تعداد کے لحاظ سے بھی برابر یعنی دس دس بیتوں کی ہیں۔

غالب

ظہوری

بعشق قابل دیوانگی خردمند ست
چو صبح من ز سیاہی بشام ماند ست
بہر ز جملہ کہ آزاد، مردِ این بند ست
چکویم کہ ز شب چند رفت یا چند ست
ظہوری کہتا ہے کہ عشق میں جو شخص دیوانگی کی قابلیت رکھتا ہے، اسی کو خردمند سمجھا جاوے۔ پس چاہیے کہ تو سب سے قطع تعلق کر دے، کیوں کہ جو شخص تعلقات سے آزاد ہے، وہی بند عشق کا مرد (یعنی اس کے لائق) ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ جب کہ میری صبح تاریکی کے سبب شام سے مشابہ ہے، تو مجھ سے یہ کیا پوچھتے ہو کہ رات کتنی گزری یا کتنی باقی ہے؟ مطلب یہ کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک میرے دن اور رات پر تاریکی پھالی رہتی ہے۔ پس مجھے کیا خبر کہ کتنی رات گزری

اور کتنی باقی ہے۔ ظہوری کے شعریں اس کے سوا کچھ جدت نہیں ہے کہ اس نے اپنی عادت کے موافق اس میں بھی صنعت تضاد کا التزام کیا ہے (یعنی دیوانگی پر فرد سندی کا اطلاق کیا ہے اور آزاد پر مقید کا) مرزا نے ایک معمولی خیال میں جدت پیدا کی ہے اور نہایت صفائی سے مطلب ادا کیا ہے۔

غالب

ظہوری

بشکر دیدہ تر، تر زبا نیے دارم نگاہ و مہر بہ دل سرندادہ چشمہ نوش
کہ زہر گرہ، طراوت رہ شکر خند مست ہنوز عیش باندا زہ شکر خند مست
ظہوری کہتا ہے کہ میں دیدہ تر کے شکر میں تر زبان اور رطب اللسان ہوں کیونکہ
گریے کا زہر معشوق کے شکر خند کو طراوت دیتا ہے (یعنی ہمارے رونے پر اس
کو بے اختیار ہنسی آتی ہے) گویا ہمارے آنسو خندہ معشوق کی جڑ کو تروتازہ رکھتے
ہیں۔ مرزا کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق کو بظاہر ہم سے ہنسی خوشی کے ساتھ
لتا ہے، مگر کوئی دلی محبت کی بات اب تک ظہور میں نہیں آئی، جس سے ہمارا
دل بلغ بلغ ہو جائے۔ اس مطلب کو اس طرح ادا کیا ہے کہ ابھی تک اس کی
نگاہ و مہر و محبت نے لذت و علالت کی سوت ہمارے دل میں جاری نہیں کی،
بلکہ ہم صرف اس کے ظاہری شکر خند پر فریفتہ ہو رہے ہیں۔

ظہوری کے ہاں وہی غفلتی مناسبتیں جیسے دیدہ تر اور تر زبانی یا زہر گرہ اور
شکر خند بہ نسبت مرزا کے زیادہ ہیں، مگر مرزا کا شعر اس سے زیادہ بلیغ پچرل اور
عاشقانہ ہے۔

غالب

ظہوری

نہ گفتہ کہ بہ تلخی بساز و پسند پذیر
پر تو کہ بارہ ما تلخ ترازیں پسند مست

مگر کہ رخصت بے طاقتی شود مرہم
کہ گوش دل شدگان دیش گشتہ پسند مست

ظہوری کہتا ہے کہ دل شدگان (یعنی ہم عاشقوں) کے کان نامحوں کی نصیحتوں سے زخمی ہو گئے۔ ان کے اس زخم کا مرہم بھی ہو سکتا ہے کہ ان کو بے طاقتی (یعنی بے حوصلگی اور عدم تحمل) کی اجازت دی جائے، تاکہ وہ نامح سے گھٹپ ہو کر اپنے دل کی بھر اس نکال لیں۔

مرزا نامح سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے نامح! تو نے یہی نہیں کہا کہ تلخی (یعنی ہماری نصیحت) سے موافقت کر لے، اور ہمارا کہنا مان لے۔ جا، اپنا رستہ لے، ہماری شراب اس نصیحت سے زیادہ تلخ ہے، پس ہم کو تیری نصیحت کی تلخی سے ہشتی کرنے کی ضرورت نہیں ہے یہ قافیہ بھی جیسا کہ ظاہر ہے مرزا کے ہاں بہ نسبت ظہوری کے زیادہ گرم بندھا ہے۔

غالب

ظہوری

چرخم کہ عہد گسل داردت کشاکشِ ناز
کہ ہر گسختنی صد ہزار پیوندست
ظہوری کہتا ہے کہ اگر ناز و غمزے کی کشاکش تجھ سے عہد شکنی کراتی رہتی ہے،
تو کچھ افسوس کی بات نہیں کیوں کہ ہر گسختنی (یعنی ہر عہد شکنی) لاکھ پیوند کا حکم رکھتی ہے۔ مطلب یہ کہ جس قدر تو عہد توڑتا ہے، اسی قدر پیوند عشق زیادہ مستحکم ہوتا جاتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ اگر میری دراز دستی اوبے باکی و رند مشربی نے دلق و روع و تقویٰ کو کسی قدر پھاڑ ڈالا ہے، تو میرا چننا تصور نہیں ہے کیوں کہ اس میں تو پہلے ہی سے ہزاروں پیوند لگے چلے آئے ہیں۔ یعنی خود اہل و روع و تقویٰ ہی اس کی دھجیاں اڑا چکے ہیں، مگر یا کلاسی سے پیوند لگا لگا کر اس کا عیب ڈھانکتے رہتے ہیں۔ ظہوری کے شعر میں عشق و محبت کے ایک دقیق معاملے کی طرف اشارہ ہے جو

عشاق پر ہمیشہ گزرتا ہے؛ اور صنعتِ نفاذ کا التزام بھی نہیں چھوڑا اگر گسختیں پر اس کے ضدِ حقیقی یعنی پیرندہ کا اطلاق کیا ہے۔ باوجودِ اس کے ظہوری کے یہاں یہ قافیہ نہایت عمدگی سے بندھا تھا، مرزا نے بھی اس قافیے کے باندھنے میں کچھ کم داریا ہمت نہیں دی، یہاں تک کہ ظہوری کے شعر کو مشکل سے اس پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔

ظہوری

غالب

بگو حدیثِ وفا از تو باور دست بگو ز بیم آنکہ مبادا بمیرم از شادی
شوم فدایِ دعوئی کہ راست ماند دست نہ گوید ارچہ بمرگ من آرد و مند دست
مرزا نے ماند کا قافیہ مطلع کے سوا پھر کسی شعر میں نہیں باندھا اور ظہوری کے ہاں آرد و مند کا قافیہ کہیں نہیں بندھا اس لیے یہ دونوں مختلف القوافی بیتیں ایک جگہ لکھ دی گئی ہیں۔ معنی دونوں کے ظاہر ہیں۔ ظہوری کا شعر بہت صاف اور لطیف اور مرزا کے شعر سے زیارہ بچل ہے۔ مرزا نے مضمون میں جدت تو پیدا کی ہے مگر یہ سن کر کہ معشوق ہمارے مرنے کا آرد و مند ہے، خوشی سے مرجانا، واقع کے بالکل خلاف ہے۔

ظہوری

غالب

ز اہل مہر و محبت نشان ندارم کس وجودِ ادہم حسن مستد، مستقیم ہمہ عشق
بہر خویش و بہیمہری تو سو گندست بہ بخت دشمن و اقبال دوست سو گندست
ظہوری کا شعر صاف ہے۔ اذل دعویٰ کرتا ہے کہ مہر و محبت کا دنیا میں کہیں وجود نہیں؛ اور اس دعوے پر اپنی محبت اور معشوق کی بیہمہری کی قسم کھاتا ہے، جس کی خوبی اور لطافت ظاہر ہے۔

مرزا کا دعویٰ یہ ہے کہ معشوق کا وجود سراپا حسن و جمال ہے اور میری ہستی سراسر عشق و محبت ہے اور اس دعوے پر رقیب کے نصیب کی اور معشوق کے اقبال

کی قسم کھاتا ہے، جس میں ظہوری کی قسم سے زیادہ لطافت اور نزاکت پائی جاتی ہے رقیب کے نصیب کی قسم اس لیے کھائی ہے کہ جو وجود سراپا حسن و جمال ہے، وہ بالکل اسی کے حلقے میں آگیا ہے، اور معشوق کے اقبال کی قسم اس لیے کھائی ہے کہ مجھ جیسا شخص اس کے سودا میں عشق و محبت کا پتلا بن گیا ہے۔ اس کے سوا لفظی مناسبتیں جیسے سن و عشق، وجود و ہستی، دشمن و دوست اور بخت و اقبال یا تمام شعر کا متناسب اجزا میں تقسیم ہونا، اس نے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے۔

غالب

ظہوری

نہ ہر دان تو منزل شمار ما کہ شمر
شمار کج روی دوست در نظر دارم
غم از کسے کہ نمیداند اندیش چہ دست
در میں نور و ہند انم کہ آسمان چہ دست
ظہوری کہتا ہے کہ تیری راہ میں جو شخص منزلیں گنتا ہے اور یہ خیال رکھتا ہے کہ کتنا سترے ہوا وہ کتنا باقی ہے، اس کو تیرے رہروں میں کون شہد کرتا ہے؟ پھر کہتا ہے کہ "غم از کسے ست" یعنی غم معشوق اس شخص کا حصہ ہے جس کو اپنے غم کی کمی یا زیادتی کا مطلق شعور نہیں۔

مرزا کہتے ہیں کہ میرے خیال میں دوست کی کج روی کا تصور ایسا جما ہوا ہے کہ مجھے یہ خبر نہیں کہ اس نورد (یعنی کج روی) میں آسمان کی کتنی شرکت ہے۔ مرزا کا بیان کسی قدر ظہوری کے بیان سے صاف ہے، مگر مضمون کے لحاظ سے دونوں شعروں میں کچھ لطافت یا خوبی معلوم نہیں ہوتی۔

غالب

ظہوری

شو گسستہ بایام، گر چہ زنجیر است
بہ رنج از پہ راحت نگاہ داشتہ اند
اسیر آنکہ بہ تار نگاہ در بند است
ز حکمت است کہ پای شکستہ در بند است
ظہوری کہتا ہے کہ ایک مدت کے بعد لوہے کی بیڑی بھی کٹ جاتی ہے اور قیدی

رہا ہو جاتا ہے۔ پس درحقیقت قید سی و سی ہے، جو ننگا و معشوق میں الجھا ہوا ہے، جس کو قید سے کبھی۔ ہائی نہیں۔

مرزا کہتے ہیں کہ یہاں تکلیف میں اس لیے رکھا جاتا ہے کہ راحت حاصل ہو، اور اس کی مثل یہ ہے کہ پاشکت آدمی کو چلنے پھرنے نہیں دیتے اور جب تک ہڈی جڑ نہ جلتے مقید رکھتے ہیں۔ اس سے مطلب یہی ہوتا ہے کہ آخر کار اس کو راحت حاصل ہو۔ ظہوری کے شعور میں کسی قدر حدت ہے، مگر شعور کی بندش نہ سست اور ڈھیلی ہے۔ مرزا کے یہاں مضمون میں کچھ ایسی حدت نہیں ہے، مگر بیان نہایت چست اور تمحیک ٹھاک ہے۔

غالب

ظہوری

زبندگان نسزد آرزو، خدا نہ کند
اگر نہ بہر من، از بہر خود عزیزم دار
میں بس مت کہ ما بندہ، او خداوندست
کہ بندہ خوبی او خوبی خداوندست
ظہوری کے شعور میں "خدا نہ کند" یا تو محض حشو ہے یا اس کے بعد کچھ عبارت مقتدرہ ہے
یعنی "خدا نہ کند کو ما آرزو بکنیم" باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

مرزا کا شعور ان کی غزل میں بیت الغزل ہے اور معنی اور غظاً دونوں طرح ظہوری کے شعور پر ترجیح رکھتا ہے۔

غالب

ظہوری

اسیر عشق، ظہوری! نشاء دارد
نہ آن بود کہ دنا خواہد از جہاں غالب
نشاء اینکه یہ بیدار دوست خرسندست
بدین کہ پُرسد و گویند ہست، خرسندست
ظہوری کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اسیر عشق کی یہ پہچان ہے کہ وہ دوست کے ظلم سے خوش رہتا ہے۔

مرزا کے شعر کا یہ مہذب ہے کہ مبرا مقصود دنا کی تلاش سے یہ نہیں ہے کہ میں اہل دنیا

سے وفا کا طالب ہوں، بلکہ میں اسی میں خوش ہوں کہ میں پوچھوں کہ دنیا میں وفا ہے؟ اور وہ لوگ اس کے جواب میں کہیں کہ ہاں ہے۔ دونوں مقطع ہموار میں مگر باوجود اس کے مرزا کا بیان بانگپن سے خالی نہیں۔

ہم نے دونوں شاعروں کی غزلوں کی شرح بخوبی کر دی ہے، مگر زیادہ نکتہ چینی کرنا غیر ضروری سمجھا ہے اور دونوں غزلوں میں محاکمہ کرنا بھی ناظرین کی رائے پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ خود بشرطیکہ فارسی شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہوں گے، اس بات کا اندازہ کر لیں گے کہ دونوں غزلوں میں کیا نسبت ہے۔

رباعیات

مرزا کی رباعیات تعداد میں قریب سوا سو کے ہیں جن میں سے اکثر شوخی و بے باکی، یادہ خواری، فخر و مباہات اور شکایت و زارنالی کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ اور کسی قدر مبہم و فائدہ اور چند خاص خاص مضامین پر ہیں۔ خمریات میں ظاہر عمر خیام کا تتبع معلوم ہوتا ہے۔ مرزا کی رباعی میں بہ نسبت عام غزلیات کے زیادہ صفائی و شگفتگی اور گری پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ان میں سے کسی تدریجاً بطور نمونے کے یہاں نقل کی جاتی ہیں۔ اور جہاں ضرورت ہوگی رباعی کے ساتھ اس کی شرح بھی کر دی جائے گی۔

فخریہ

غالب یہ گہر زردہ زاد شمم (۱) زان رو بصفائی، دم تیغ ست دم
چورف سپیدی، زدم جنگ بستہ تیر شکستہ نیاگاں، قسم

مگر وگو ہر اصل اودودہ نسل و خاندان۔ زاد شم، پشنگ کے باپ اور تورابن فرید کا
 کے بیٹے کا نام ہے، جس کی نسل میں مرزا اپنے تئیں بتاتے ہیں۔ دم تیخ، تلوار کی
 دھار۔ دم یعنی میرا کلام۔ سپہبدی، سلطنت و سپہ سالاری۔ نیا، وارا، نیاکان
 جمع۔ کہتا ہے کہ جب سپہبدی ہمدی قوم سے رخصت ہو گئی تو میں نے شو کہنا اختیار
 کر لیا، گویا بزرگوں کا ٹوٹا ہوا تیر میرا قلم بن گیا۔

تفصیل

شرطت کہ بہر ضبط آداب و رسوم (۳) خیزد بعد از بنی، اما ہم معصوم
 نا جماع چہ گوئی، بہ علی باز گراے مر جائے نشین مہر باشد نہ نجوم
 یہ رباعی مرزا کے تفصیل ہونے پر دلالت کرتی ہے نہ تشبیح پر کیوں کہ غلط ہے ثلثہ پر
 نجوم کا اطلاق حضرات شیو نہیں کر سکتے۔

تصویر

راہبست ز عہد تا حضورِ اللہ (۳) خواہی تو دراز گیر و خواہی کوتاہ
 ایں کوثر و طوبی کہ نشا نہا دارد سرچشمہ و سایہ ایست و نہ نیمہ راہ
 کہتا ہے کہ بندے سے خدا کی حضور تک ایک راہ ہے، خواہ اس کو دراز سمجھو،
 خواہ کوتاہ سمجھو اور یہ جو کوثر و طوبی ہیں جن میں اس کی راہ کے کچھ کچھ نشان پائے
 مانتے ہیں، یہ ایسے ہیں جیسے اٹلے راہ میں چشمہ اور سایہ آجاتا ہے۔

شوخی

اے مرد کہ زن گرفت، دانا نہ بود (۴) از غصہ فراغتش، ہسانا نہ بود
 دارد بہ جہاں خانہ وزن نیست درو نازم بخدا، چرا توانا نہ بود
 تیسرے مصرعے میں درد کا فاعل خدا ہے، جس کا نام چوتھے مصرعے میں لیا ہے۔
 خانہ سے مراد خانہ کعبہ ہے باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

شوخی

بارست غم آں باد کہ حاصل برد ۵۱، آپ رُخ ہوشمند و غافل برد
 بگڑا شہ ام خے ز صہیا بہ پس۔ کبش اندوہ مرگب پرد از دل برد
 کہتا ہے کہ غم ایک ہوا ہے۔ ایسی ہوا کہ تمام غرمن کو اڑا کر لے جائے، اور دانا
 اور نادان کی آہ کو بہلے جلے۔ اسی لیے میں بیٹے کے لیے ایک شراب کا شکا
 چھوڑ چلا ہوں، تاکہ باپ کے مرنے کا غم اس کے دل سے دھو دے۔

شوخی

لے آنکہ براؤ کعبہ زوے داری ۷۱، نازم کہ گزیدہ آرزو سے داری
 ز تبا گو نہ کہ تہندی خسرامی، دانم در خانہ زن ستیزہ خوے داری
 کہجے جانے ولے سے کہتا ہے کہ تیرا ارادہ تو بہت عمدہ ہے، مگر تو جو ایسا بھاگا
 جاتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ تیرے گھر میں بد مزاج عورت ہے جس کے سبب سے
 کہجے جانے میں اس قدر عجلدی ہے۔

فخریہ

شاہا! ہر چند وایہ جو آمدہ ام (۷۰) دانی کہ چہ مایہ نغسہ گو آمدہ ام
 رنگم کہ بہار را بہ زو آمدہ ام آہم کہ محیط را بجو آمدہ ام

بے تعلقی

ز اسجا کہ ولم یو ہم وہ بند نبود (۸) با هیچ علاقہ سخت پیوند نہ بود
 مقصود من از کعبہ و آہنگ سفر جز ترک دیار زن و فرزند نبود
 یعنی چوں کہ میں وہم میں، جو نیست کو بہت کی صورت میں دکھاتا ہے، گرفتار
 نہ تھا، اسی لیے کہجے کے عزم سفر سے میرا مقصد زن و فرزند کا ملک چھوڑ دینے
 کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

ماشقانہ

اے جام شراب شاد کامی زدہ (۹) درد جو دم از بند نامی زدہ
یاد آرز من چو بیتی اندر ہے تنہا رخصتہ حرامی زدہ
حرامی، قزاق۔ حرامی زدہ، قزاقوں کا لوٹا ہوا۔ اس شعر میں معشوق کی طرف خطاب
کیا ہے اور اپنی حالت کو اس مسافر سے مشابہ بتایا ہے جو تنہا ہو، مجروح ہو، اور
قزاقوں نے اُسے روٹ ریا، گویا معشوق کو قزاق ٹھیرایا ہے۔

تونی

اے آنکہ ترا سعی بدرمان من ست (۱۰) منعم کمن از بارہ کہ نقصان من ست
حیف ست کہ بعد من، بمیراث رود ایں یک دوسہ خم کہ در شبتان من ست
طیب کی طرف خطاب ہے کہ مجھے بیلہری میں شراب سے کیوں منع کرتا ہے؟ اگر میں
مر گیا تو غضب ہو جائے گا، کہ یہ اکٹھے دو تین مشکے میرے کام تو نہ آئیں گے، میرے
وارثوں کو پہنچ جائیں گے۔

شکوہ روزگار

آتم کہ بہ پیما نہ من ساقی دہر (۱۱) ریزد بہ درد درد تلخ آب زہر
بگذر سعادت و نحوست کہ مرا ناہید بہ غمزہ گشت و مرتیخ بقہر
ناہید یعنی زہرہ کو سعد اور مرتیخ کو نحس قرار دیا گیا ہے۔ کہتا ہے کہ سعادت و نحوست
کے خیال کو جانے دو، میرے حق میں تو سعد و نحس دونوں ہم کے تارے نحس ہو گئے
کہ زہرہ نے مجھے غم سے قتل کیا اور مرتیخ نے قہر سے۔

افسوس بردفات و من خان

شرطت کہ روی دل خراشم بہ عمر (۱۲) خوتا بہ بدخ زدیدہ پاشم بہ عمر
ماں یا شم اگر برگسب موتمن چوں کعبہ سید پوش یا شم بہ عمر

ترکِ مراد

غالب روشِ مردمِ آزادِ عبادت (۱۲) رفتارِ اسیرانِ رہ و زادِ عبادت
 ماترکِ مرادِ اِرم سے دانیم وہاں باغِ ضبطی شدادِ عبادت
 یعنی آزاد لوگوں کی اور روش ہے اور جو لوگ توشہ اور رسم و راہ کے گرفتار ہیں
 ان کا اور ڈھنگ ہے۔ ہم کہ آزاد لوگ ہیں، ہمارے نزدیک ترکِ مراد کا نام اِرم
 ہے اور وہ اِرم جس سے شداد محروم رکھا گیا، وہ ہمارے اِرم سے الگ ہے۔
 شکریہ دردِ دنامہ

ایں نامہ کہ راحتِ دلِ بدیش آورد (۱۳) سرمایہٴ ابر سے درویش آورد
 درہر بُنِ نو دمید جانے یعنی سامانِ تارِ خویش با خویش آورد

تصویر

منصورِ غمش ز نکتہٴ چیناں چہ بود (۱۵) در راستِ خطر ز ہوشیناں چہ بود
 چوں عاقبتِ یگانہٴ بیناں دارست دریاب کہ انجامِ دو بیناں چہ بود
 کہتا ہے کہ اگر منصور کو لوگ کہیں کہ سولی پر چڑھایا گیا اور زلت سے مارا گیا
 تو منصور کو اس کی کچھ پروا نہیں۔ مگر تم دیکھو کہ جب منصور جیسے یگانہ بین لوگوں
 کا انجام دار ہے، تو دو بینوں کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

شوخی

ہر کس ز حقیقتِ خبر سے داشتہ است (۱۶) بر خاکِ رہ و بزمِ سر سے داشتہ است
 زاہدِ ز خدا اِرم بدعوے طلبہ شداد ہما نا پسرے داشتہ است
 کہتا ہے کہ جو شخص اپنی یا انسان کی حقیقت سے واقف ہوتا ہے، اس کو عاجزی
 کرنے کے سوا کچھ بن نہیں آتی۔ پس زاہد جو خدا سے اِرم بدعوے کے ساتھ طالب
 کرتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ شداد نے بیٹا اپنا وارث چھوڑا تھا کیوں کہ اول تو اِرم

جو کہ متروکہ شداد ہے اس کا دعویٰ کرنا اور پھر خدا کے سامنے اس کے مانگنے
میں ہیکڑی کرنی، یہ دونوں باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ شداد نے اپنا وارث
حقیقی چھوڑا تھا۔
شوخی

غالب! یہ سخن گر چہ کست ہمسریت (۱۰) از نشہ ہوش ہیبت اندہ سر نیست
نئے خواہی و مفت و لغو آنگہ بسیار ایں بارہ فروش ساقی کوثر نیست
کہتا ہے کہ اے غالب! اگرچہ شاعری میں کوئی تیرا ہمسر نہیں، مگر عقل کا نشہ تیرے
دامغ میں بالکل نہیں ہے؛ ثمراب چاہتا ہے اور وہ بھی مفت اور وہ بھی عمدہ، اور
پھر کثرت سے! یہ بارہ فروش ہے ساقی کوثر نہیں کہ تیری سب خواہشیں پوری کرے گا۔
شوخی

گردین زلہاں بخت گستاخ (۱۸) ویں دست دلی بہ ٹر شاخ بشاخ
چوں نیک نظر کنی زردے تشبیر ماند بہ بہائم و طع زار فراخ
یعنی زلہاں کا بہشت میں بے پاک پھرنا، اور جا بجا ٹہنیوں پر پھلوں کے لیے ہاتھ مارنا
اگر غور کر کے دیکھو، تو اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک وسیع چراگاہ ہے اور اس
میں ڈھونڈ مگر چرتے پھرتے ہیں۔
اخلاق

آرا کہ بود درستی در فرجام (۱۹) ہم محرم خاص آید ہم مرجع عام
آساں نہ بود کشاکش پاس قبول زہار نہ گری بہ کوئی بدنام!
فرجام، انجام اور رنگ و رونق کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں رنگ و رونق یعنی شہرت و
ناموری مراد ہے۔ کہتا ہے کہ جس کی شہرت صحیح اور سچی ہوتی ہے، وہ ضرور ہے کہ
خواہم کا محرم اور عوام کا مرجع واقع ہو۔ مگر پاس قبول کی کشاکش یعنی ہر موقع پر

اس بات کا خیال رکھنا کہ قبولیت میں فرق نہ کئے، نہایت سخت چیز ہے۔ پس ہرگز نیکی کے ساتھ بدنام یعنی مشہور ہوتا نہیں پایا ہے۔ اس موقع پر بجائے مشہور کے بدنام کا لفظ نہایت یلغ واقع ہوا ہے، جس سے ساری رباعی میں جان پڑ گئی ہے۔
شوقی

در عالم بے زری کہ تلخت میات (۲۰) طاعت نہ توں کردہ امید نجات
اے کاش از حق اشارت صوم و صلوٰۃ بودے بوجہ دہل چوں جمع ذکوٰۃ
کہتا ہے کہ یہ مقدوسی کی حالت میں جب کہ زندگی تلخ ہوتی ہے، نجات کی امید پر طاعت نہیں ہو سکتی۔ کاش ایسا ہوتا کہ جس طرح جمع اور زکوٰۃ میں استطاعت اور تمول شرط ہے روزے اور نماز میں بھی یہی شرط ہوتی۔
شکایت اتناے زان

ہر چند زمانہ مجمع جہال ست (۲۱) در جہل نہ عالیشان یک منوال ست
کون ہر ایک از یکے تا دگرے فرق خرمیسی و خرد جبال ست
کہتا ہے کہ اگرچہ زمانے میں جہڑاں جاہل بھرے ہوئے ہیں، مگر جہل میں ان کا عمل متفاوت و مختلف ہے۔ کون تو سب میں، مگر ایک دوسرے میں ایسا فرق ہے جیسا خرمیسی اور خرد جبال میں۔
میکش و جوہر

تا میکش و جوہر دو سخنور داریم (۲۲) شان دگر و شوکت دگر داریم
در میکدہ پیریم کہ میکش از راست در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم
یہ رباعی منشی جواہر سنگہ جوہر اور میرا حمد حسین میکش کے حق میں کہ دونوں مرزا کے عزیز شاگردوں میں سے تھے، لکھی ہے۔ در میکدہ پیریم یعنی پیر مغایم۔ باقی رباعی کے معنی ظاہر ہیں۔

فخریہ

دستم بہ کلیدِ مخزنے مے بایست (۲۳) و در بود تہی بدارنے می بایست
 یا پیچ گہم بہ کس نیفتادے کار یا خود ہزار چوں منے می بایست
 کہتا ہے کہ یا تو میرے ہاتھ میں کسی خزانے کی کنجی چاہیے تھی، اور اگر ہاتھ خالی
 ملا تھا تو اس میں کسی کا دامن ہونا چاہیے تھا، جس کے تو تسلسل سے زندگی بسر پتی
 یا مجھ کو کبھی کسی سے کام نہ پڑتا اور یا زمانے میں خود مجھ جیسا صاحب کمال ہوتا
 جو میری قدر کرتا۔
 امیدِ نغو

دستم نے امیدِ سرمست و بس دست (۲۴) دارم سراں کلاوہ در دست و بس دست
 مگر اندیشِ لطف و کرم نیست! استحقاقِ تہمت دست و بس دست
 سراں کلاوہ یعنی سراں رشتہ۔ باقی معنی ظاہر ہیں۔
 خطاب با غنیاء

گر گرد ز گنج گہرے برخیزد (۲۵) پسند کہ دود از جگرے برخیزد
 منت نہ توں نہاد برگد یہ گراں بخشیں کہ بخدمت و گہرے برخیزد
 گنج گہرے گرد اٹھنے کے معنی اس کے خالی ہو جانے کے ہیں۔ کہتا ہے کہ اگر خواہاں
 کا خزانہ خالی ہو جائے، تو بلا سے، مگر یہ گوارا مت کر کہ کسی کے جگرے دھواں اٹھے۔
 بھیک مانگنے والوں پر احسان نہیں رکھا جاسکتا۔ خدا نے ان کی خدمت پر تجھ کو کھڑا کیا ہے۔ اگر تجھ
 سے یہ خدمت پوری نہیں ہو سکتی تو بیٹھ جا، تاکہ دوسرا اس خدمت کے لیے اٹھے۔
 عاشقانہ

لے دست بشوی ایں فروماندہ بیا (۲۶) از کو چہ غیراہ گردانندہ بیا
 گفتم کہ مرا مخواں کہ من مگر تو ہم برگفتہ! خویش باش و ناخواندہ بیا

اوپر کے دونوں مصرعے صاف ہیں۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ اے دوست! تو نے مجھ سے
کہا تھا کہ مجھے مت بلانا، میں تیری موت ہوں۔ اچھا اب تو اپنے کہنے پر قائم رہا اور
جس طرح کہ موت بن بلائے آتی ہے، تو بھی بن بلائے چلا آ۔

اے آنکہ ہما اسیر دامت باشد (۲۷) صاف بے خسروسی بجا مت باشد
تسبیح ہیرا سم الہی کہ بود آغاز ذابتدائے نامت باشد
یہ رباعی سبحان علی خان مرحوم کو جو مرنے کے خط لکھا تھا، اس کے آدھ میں لکھی تھی۔
معنی ظاہر ہیں۔
انید بے۔

بازی خور روزگار بودم ہمہ عمر (۲۸) از بخت امیدار بودم ہمہ عمر
بے مایہ بگر سودا مند ہمہ جا بے وعدہ در انتظار بودم ہمہ عمر
خطاب بانگیا

باید کہ دلت ز عرصہ برسم نہ شود (۲۹) از رفتن ز دست خوش غم نہ شود
ایں سیم دز دست خواجہ! ایں سیم دزد غم نیست کہ ہر چند خدی اکم نہ شود
دست خوش، مغلوب وزیر دست۔ کہتا ہے کہ اے دولت مند! چاہیے کہ روپے کے
کم ہو جانے سے تیرا دل پریشان اور غم میں رہا ہوا نہ رہے۔ اے حضرت! یہ سیم دزد
ہے، اور پھر کہتا ہوں کہ سیم دزد ہے! یہ غم نہیں ہے کہ جس قدر کھائے جائیے، کم
نہیں ہوتا۔
گرانی گوش

دلہم دل شاد و دیدہ بینائے (۳۰) و ز کڑی گوشم نہ بود پروائے
خوبست کہ نشنوم زہر خود ملے گلبانگ آثار یکم الا ملائے
کہتا ہے کہ مجھ کو کڑی گوش یعنی ثقلِ سماعت کی کچھ پروا نہیں، البتہ اس کو بہتر

سمجھتا ہوں کیوں کہ مغز و رادر خود پسندوں کی زبان سے آثارِ بکم الاعلیٰ (جو کہ فرعون کا مقولہ ہے) نہیں سنتا۔

توحید و توحیدی

اے کردہ باریش گفتار بسیج (۲۱) در زلفِ سخن کشودہ را و خم و پیچ
عالم کہ تو چیزے گریش میدانی ذاتے بسیط منبسط، دیگر بسیج
بسیج، قصد زلفِ سخن میں خم و پیچ کی راہ کھولنے سے مراد بیان میں پیچیدگی پیدا
کرنی۔ کہتا ہے کہ عالم جس کو تو نے کچھ چیز سمجھ رکھا ہے، وہ صرف ذاتِ واحد ہے،
جو بسیط ہے۔ یعنی مرکب نہیں اور منبسط ہے یعنی تمام فضا میں پھیلی ہوئی ہے،
بس اس کے سوا کچھ نہیں۔

شکایت

اے تیروز میں کہ بودہ بستر من (۲۲) ہر خاک کہ باقت، ہمہ بزمِ من
زہرِ ہر کسان و ہر من دانہ و دام لسا و بدیگراں و ماؤندہ من
ماؤندہ، سوتیلی ماں کو کہتے ہیں۔ زمین سے خطاب کرتا ہے کہ اوروں کے لیے تو تھو پر
سونا بچھا ہوا ہے اور میرے لیے دانہ و دام کے سوا کچھ نہیں، گویا تو اوروں کی ماں ہے
اور میری میندر ہے۔ یہ مضمون تھوڑے تھوڑے فرق سے رود کی اور فرخی نے
بھی باندھا ہے، مگر رزا کے ہاں سب سے عمدہ طور پر بندھا ہے۔ رود کی کہتا ہے:
جہانا! چہ بینی تو از بچگاں کہ مادر گہے، گاہ مادندری

اند فرخی کہتا ہے:

مہرِ فرزندی بر خواہ نکلندہ ست جہاں ایں جہاں مادرِ اونیست کہ مادندہ را وست
رسوائی

آزادہ دست بے زری پامال ست (۳۲) رسوائی نیز لازم احوال ست

ما خشک لبیم و خرقہ آوردہ بے ساقی مکرش پیالہ از فوہالست
 کہتا ہے کہ مغلس آدمی کے لیے یہ بھی ضرور ہے کہ رسوا اور بدنام ہو۔ چنانچہ ہم کو
 دیکھو کہ ہمارے ہونٹ تو خشک ہیں اور کپڑے شراب میں اکوردہ ہیں۔ گویا ساقی
 کا جام چھلنی کا بنا ہوا ہے کہ نہ تک آتے آتے ساری شراب کپڑوں پر ٹپک
 جاتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ مغلس آدمی جو شراب پینے لگتا ہے وہ بہت جلد بدنام
 اور رسوا ہو جاتا ہے کیوں کہ کبھی کلال کی دکان پر جا کر ہاتھ بٹارتا ہے، اور
 جو تھوڑی بہت مل جاتی ہے تو بد مست ہو کر اس کی دکان ہی پر یا راہ میں
 گر پڑتا ہے، آنے جانے والے سب اس کو دیکھتے ہیں۔ کبھی کلال کے دام چڑھ
 جاتے ہیں، تو اس سے بازار میں تکرار ہوتی ہے، اور سب لوگ دیکھتے ہیں۔
 حال انکو کبھی اس کو اطمینان سے سیر ہو کر شراب پینی میسر نہیں ہوتی۔ اس علت
 کو اس تمثیل کے پیرایے میں بیان کیا ہے کہ گویا ساقی تقدیر ہم کو چھلنی کے
 پیالے میں شراب دیتا ہے کہ ہونٹ تک تو تر نہیں ہوتے اور کپڑے سارے
 شرابور ہو جاتے ہیں۔ ایسی بلیغ تمثیلیں بہت کم دیکھی گئی ہیں۔
 علت غائی جہنم

اے دارہ بباد عمر در لہو و فسوس (۳۴) ز تہار مشوز رحمت حق بالوس
 تہشدار! کز آتش جہنم حق را تہذیب غرض بود نہ تعذیب نفوس
 فسوس، ہزل و استہزا۔ کہتا ہے کہ جہنم میں ڈالنے سے بندوں کو تکلیف دینی مقصود
 نہیں ہے، بلکہ جس طرح سونے کو آگ میں تپانے سے اس کی کھوٹ
 نکالنی مقصود ہوتی ہے، اسی طرح آتش جہنم سے نفوس انسانی کو تہذیب
 کرنا مقصود ہے۔

شوخی

یلرب تو کجانی کہ بہ ماز نہ دی (۳۵) بیدرد خدائی کہ بہ ماز نہ دی

نے نے، تو نہ غائبی و نہ بیرحمی بے مایہ چو مانی کہ یہ ماند نہ دہی
 اس رباعی میں مرزا کی شوخی و گستاخی حد سے زیادہ گزر گئی ہے۔ دارالافتا میں
 تو یقیناً اس پر کفر کا فتویٰ دیا جائیگا، لیکن ہمارے نزدیک ایسے کلام سے
 بجائے کفر کے زیادہ تر قائل کے ایمان اور یقین پر استدلال ہوتا ہے۔ صاف
 پایا جاتا ہے کہ سائل معاش کی تنگی و قراخی و خوش حالی و بد حالی کو محض خدا
 کی طرف سے جانتا ہے، اور تدبیر و عقل و دانش کو اس میں بالکل عاجز و در ماندہ
 سمجھتا ہے، یہاں تک کہ جب معاش سے بہت تنگ ہوتا ہے تو یہ نہیں خیال کرتا
 کہ ہم نے تدبیر نہیں کی، یا تدبیر میں مجھ سے غلطی ہو گئی، یا ہماری کاہلی و سستی سے
 یہ تنگ دستی ہم کو نصیب ہوئی، بلکہ نہایت تعجب کے ساتھ خدا کی جناب میں عرض کرتا
 ہے کہ کیا تیرا خزانہ خالی ہو گیا ہے، جو ہم کو کچھ نہیں ملتا؟ ہاں، اس قسم کے خطابات
 آدابِ شریعت کے بالکل خلاف ہیں، اور ایسے ہی خطابات کی نسبت کہا گیا ہے:
 مبروں را نگریم و قال را مبروں را نگریم و قال را

قصائد

مرزا کے قصائد، جن میں قطعات، نوے، ترکیب بند، ترجیع بند، پنجس
 وغیرہ بھی شامل ہیں۔ کیا باعتبار کیفیت اور کیا بلحاظ کیفیت کے ان کے اصنافِ
 نظم میں سب سے زیادہ ممتاز صنف ہے۔ اگرچہ مرزا کی غزل کا ایک معتد بہ حصہ
 متاخرین کے طبقے میں کسی بڑے سے بڑے نامور اور مسلم الثبوت استاد کی
 غزل سے گرا ہوا نہیں ہے، بلکہ اکثر کی غزل پر ہر ایک لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے

مگر اسی کے ساتھ غزلیات کا ایک دوسرا حصہ ایسا بھی ہے جس میں تغزل کی شان یعنی عام فہم اور عام پسند ہونا، بہت کم پایا جاتا ہے۔ بخلاف قصیدے کے کہ اس میں قصیدے کی شان جیسی کہ ہونی چاہیے، اول سے آخر تک یکساں طور پر جلوہ گر ہے۔

قصائد میں مرزا نے کہیں عاقانی کا تتبع کیا ہے، کہیں سلمان و ظہیر کا، اور کہیں عرفی و نظیری کا؛ اور ہر ایک منزل کا میابی کے ساتھ ملے کی ہے۔ مرزا کی تشبیب بہ نسبت مدح کے نہایت شاندار اور عالی رتبہ ہوتی ہے اور اسی سے قصیدے کی پستی و بلندی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ مشرقی شاعری میں عموماً اور ایران کی شاعری میں خصوصاً کوئی مضمون مدح و ستائش سے زیادہ پھیکا، سیٹھا، ٹھنڈا اور بے طعم نہیں ہوتا، علی الخصوص متاخرین نے مبالغہ کی گئی کو بڑھاتے بڑھاتے مدح کو، بھوکے درجے تک پہنچا دیا ہے اور اس کلمے سے مرزا کی مدح بھی مستثنی نہیں۔ البتہ عرفی نے مدح مبالغوں میں ایک قسم کا بانگین پیدا کیا ہے، جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ جس طرح قدما کے قصائد میں وہ آن نہیں پائی جاتی اسی طرح مرزا کے قصائد بھی اُس سے معز ہیں۔ لیکن مرزا کے اکثر قصیدوں کی تشبیب کچھ شک نہیں کہ عرفی کی تشبیہوں سے سبقت لے گئی ہیں۔

چوں کہ مرزا کے تمام قصائد اور ان کے ملحقات کے انتخاب کی اس مختصر میں گنجائش نہیں ہے اس لیے ہم ایک آدھ پورا قصیدہ اور باقی صرف چند تشبیہیں اور ایک آدھ مدح اور کچھ قطعے اور نوے بطور نمونے کے اس مقام پر نقل کرتے ہیں اور اخیر میں مرزا کا ایک ترکیب بند نظیری کے ترکیب بند کے ساتھ اس غرض سے نقل کریں گے تاکہ اصلاً و ذوقاً صحیح کو دونوں کے کلام میں موازنہ اور اس بات کا اندازہ کرنے کا موقع ملے کہ مرزا نے اکبری طبقے کے چیدہ اور برگزیدہ شعرا کے تتبع کو کس حد اور کس درجے تک پہنچایا تھا۔

توحید

انتخاب از قصیدہ توحید الہی

اے زوہم غیر غوغا درجہاں انداختہ
دیدہ بیرون و درون از خویشتن پروا نگہے
نقش بر خاتم زحرف بے صدا انگیزد
چرخ را در نقاب ابداع در و آریختہ
عاشقاں در موقوف دار و رسن واداشتہ
رنگہا در طبع ارباب قیاس آمیزتہ
با چنین ہنگامہ در وحدت نمی گنجد ولی
دولی کو مردے سے اور وحدت کو دریا سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی جس طرح دریا مردے

گفتہ خود حرفے و خود را در گمان انداختہ
پردہ ریم پرستش در میان انداختہ
شود در عالم ز حسن بے نشان انداختہ
خاک را بر نطع پیدائی ستان انداختہ
غانیاں در معرض تیغ و سنان انداختہ
نکتہ ہا در قاطر اہل بیابان انداختہ
مردہ را از خویش دیا بر کران انداختہ
دولی کو مردے سے اور وحدت کو دریا سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی جس طرح دریا مردے
کو باہر پھینک دیتا ہے، اسی طرح باوجود ہنگامہ کثرت کے وحدت میں دولی نہیں
سا سکتی۔ بالکل نئی اور نہایت بلیغ تشبیہ دی ہے۔

نردبالے بستہ بار یوار کاخے در نظر
رفتہ ہر کس تا قدمگا ہے و زانجا خویش را
غم چو گیر و سخت منتواں شکوہ از دلدار کرد
گل چو بلندیرا گردد بر دلش بازار سرد
آتشے از زوے گلہاے بہار افروختہ
دجلہ در ساغر معنی طرازاں ریختہ
جذبہیں آب اکشر زردشت نتواں سرد کرد

انتعاشے گد نہاد این و آن انداختہ
پایہ پایہ از فسرانہ نرد بان انداختہ
بہر آسانی اساس آسمان انداختہ
بہر تجدید طرب طرح خستہ ان انداختہ
شعلہ در جان درغ صبح خوان انداختہ
رشمہ در کاسہ دریا و کان انداختہ
کعبہ را جوے بہشت از تاودان انداختہ

جز بدیں الماس نتوان پہنچیں دُردارِ مسفت
یعنی آتشِ زردشت ہر ایک پانی سے نہیں بجھ سکتی تھی، اس لیے میرزا بیکعبہ سے بہشت
کی نہر جاری کر دی اور کیشِ منہاں ایک ایسا موتی تھا کہ اسلام جیسے الماس کے سوا
اس کا بندھنا، یعنی اس میں رخِ نہ ڈالنا ناممکن تھا۔

چشمِ را بخشد چو ناگردشے کار بابِ ہوش
دادہ ابر و را بدانساں جہتے کابلِ قیاس
ای ز شرمِ خاکسارانِ تو، از شہرِ ہما
ذوقِ تمکینِ گدایانِ تو، گنجِ شاہِ را
تاریں صورتِ ز چشمِ دشمنانِ پنہاں بود
تا علاجِ خستگیِ آسایشِ دیگر دہد
ہم زمیں دانند طرحِ آسمانِ انداختہ
در تنِ شمشیر ہندار ند جانِ انداختہ
چوں کلیم کہنہ قل را بر کرانِ انداختہ
از دلِ گنجور و چشمِ پاسبانِ انداختہ
دوست را اندر ظلمِ استخوانِ انداختہ
خارہ در رگزارِ میہسانِ انداختہ
مرثیہ و نوحہ

منقبت از قصیدہ سید الشہدا

کفست کفر، در پے روزی شانمن
گاہے بدایغِ شاہد و ساتی گداختن
باید بدرد ہرزہ گرستن، و گر گریست
رُشک آیدم بہ ابرکہ در حدِ وسعِ اوست
رفت آنچہ زنت، بایدم اکنوں نگاہداشت
بارانِ رحمتے اکہ باندا ز شست و شو
خود را ندیدناں لبِ نوشیں بکامِ خویش
نگست ننگ، در غیمِ زنی گریستن
گاہے بمرگِ مالک و بابا گریستن
بیجا گریستیم، در یغِ گریستن
بر خاکِ کر بلا سے معیے گریستن
از بہرِ نورِ دیدہ زہرا گریستن
دارد بہ رُوسیاہی اعدا گریستن
زید بہ شورِ بختی دریا گریستن

مزد شفاعت و صلہ صبر و خوبیہا
چوں زندہ غیب درد ترا عام کردہ اند
نوحہ

اے فلک! ہم از ستم برخاندانِ مصطفیٰ
لے بھر و ماہ نازیں پیچ میدانی چہ رفت
سایہ از سر و روانِ مصطفیٰ لغتہ بجاک
گر می بازار امکان خود طفیلِ مصطفیٰ است
کینہ خواہی میں کہ با اولادِ امجادش کینی
نیک بودگز تو بر فرزندِ دلہندش رود
یا تورانی مصطفیٰ را فارغ از رنجِ حسین
یا مکرگاہت نمیدی مصطفیٰ را با حسین
آں حسین ست اینکہ گفت مصطفیٰ "روحی زندک"
آں حسین ست اینکہ شود مصطفیٰ چشمش برف
قدسیان انطوق من آوردہ غالب اور سماع
نوحہ

اے کج اندیشہ فلک! حرمت دیں بایستے
تاجہ افتاد کہ بر نیزہ سرستش گردانند
حیف باشد کہ فتنہ خستہ ز تو سن بر خاک
حیف باشد کہ ز اعدا دم آئے طلبد

پیچ از کے نحواستہ انا گریستن
سری زندہ ز مومن و حرما گریستن

داشتی زیں پیش سر بر آستانِ مصطفیٰ
از تو بر چشم و چراغِ دودمانِ مصطفیٰ
ہاں چہ بر خاک افکنی سر و روانِ مصطفیٰ
میں چہ آتش میزنی اندر دکانِ مصطفیٰ
آنچہ بامہ کردہ اعجب از بنانِ مصطفیٰ
آنچہ رفت از مرتضیٰ بردشمنانِ مصطفیٰ
یا تو خواہی زیں محبت امتیانِ مصطفیٰ
یا مگر ہرگز نبودی در زمانِ مصطفیٰ
چوں گنشتہ نام پاکش بر زبانِ مصطفیٰ
بوسہ چوں باقی نمازدے درد ہاںِ مصطفیٰ
گشتہ ام در نوحہ خوانی مرح خوانِ مصطفیٰ

علم شاہ نگوں شدہ نہ چنیں بایستے
عزت شاہ شہیداں پہ ازیں بایستے
آں کہ جولا نگہ او عرش بریں بایستے
آنکہ سائل بدیش روح امیں بایستے

تازیان را بہ جگر گوشہ احمد چہ نزاع
ایہا القوم! منزل بود ار خود گویم
یعنی یہ تو ادنی درجے کی بات ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ اہل شام کر بلا کا یہاں خنجر
کیسے محفوظ رہنا چاہیے تھا، بلکہ جو سخن اس موقع پر کہنے کے لائق ہے وہ یہ ہے
یعنی جیسا کہ اگلے اشعار میں بیان ہوا ہے۔

سخن اینست کہ در راہ حسین ابن علی
چشم بد دور، بہ ہنگام تماشاے رخس
داشت نا خواستہ در شکر قد و مش ہارن
چوں بفرمان خود آرائی و خود بینی و بغض
یا سیران ستم دیدہ پس از قتل حسین
چہ ستیزم بقضا، ورنہ بگویم غالب!
نوحہ

سوزد نفس نوحہ گر از تلخ نوائی
بردگہ شاں کردہ فلک نامیہ سال
چوں شعلہ دغاں بر سر شاں کردہ ردائی
دلہا ہمہ خون گشتہ اندوہ رہائی
اے خاک! چو اہل شداد گرا سودہ چرائی؟
بر خیز و بخون غلط، گرا از اہل وفائی
اکبر! تو کجا رفتی و عباس! کجائی؟

تو قیغ شفاعت کہ پیمبر ز خدا داشت
 فریاد ازاں عامل منشور امامت!
 فریاد ازاں زاری و خوتا یہ فشانی!
 فریاد ز بیچارگی و خستہ درونی!
 غالب! جگرے خون کن و از دیدہ فرو بار
 نوحہ

از خون حسین ابن علی یافت روائی
 فریاد ازاں نسخہ اسرار خدائی!
 فریاد ازاں زاری و بے برگ و نوائی!
 فریاد ز آوارگی و بے سرو پائی!
 گر روئے شناس غم شاہ شہدائی

سرو چمن سرودی افتاد ز پا، ہاے
 بر خاک رہ افتارہ تنے ہست سرش کو
 عباس دلاور کہ دریں راہروی داشت
 آن قاسم گلگون کفن عرصہ محشر
 آن اصغر دل خستہ پیکان جگر دور
 لے قوت بازوے جگر گوشہ زہرا!
 اے شہرہ بدمادی و شادی کہ نداری
 اے مظهر انوار کہ بود اہل نظر را
 اے گلبن نورستہ گلزار سیادت
 اے منبع آن ہشت کہ آرایش خلدند
 باغ نظرانِ ردش دینِ نبی حیث!
 ماتم کہہ آن خیمہ غارت ز دکان حیث!
 آن تابش خورشید در آن گرم روی حیث!

شد غرقہ بخوں پیکر شاہ شہدا، ہاے!
 آن روئے فروزندہ و آن زلفِ دنا، ہاے!
 شمشیر بیک دست و بیک دست لوا، ہاے!
 و آن اکبرِ خونیں تن میدانِ وغا، ہاے!
 و آن عابدِ غمدیدہ بے برگ و نوا، ہاے!
 دست تو بشمشیر شد از شانہ جدا، ہاے!
 کافور و کفن، بگذرم از عطر و قبا، ہاے!
 دیدار تو دیدارِ شہرہ ہر دوسرا، ہاے!
 نایافتہ دریاغ جہاں نشو و نما، ہاے!
 و غم کہ رسن شد بجلوے توروا، ہاے!
 قدسی گہرانِ حرم شہر خدا، ہاے!
 غارت زدہ آن قافلہ آلِ عبا، ہاے!
 و آن طعنہ کفار و دریاں شور عزا، ہاے!

غالب! بسلامتک نتواں گشت ہم آواز
 اندازہ آن کو کہ شوم نوحہ سرا، ہاے!

قصیدہ ضربکیہ

بیاد کر بلا تا آن شمشک کارواں بینی
 نہ بینی پیچ بر سر خانان گنج عصمت را
 ہا تا سبیل آتش برده بجگا و غریباں را
 بہ بینی چشمہ از آب و چوں جوی کنارش را
 بہ بینی سرخوش خواب عدم عباس غازی را
 ہجوم خستگان و سوز و ساز نو گرفتار را
 نمی بینی کہ چوں جاں ملول از بیدار بدخواہاں
 گرفتہ کایں ہمہ بینی دلے دلے و چشمے ہم
 چہ دندان در حیکر افشردہ باشی کا ندران داری
 نیاری گرد راں کوشی کہ پایش در کاب آری
 تنے را کش رگ گل خار بودے بر زمیں یابی

ستایش روزگار

تشبیب قصیدہ منقبت امام دوازدهم
 ہست از تمیز گر بہ ہما استخوان ہست
 مردست مرد ہر چہ کند بے خطر کند
 گلزار را اگر نہ شمس گل بہم نہ ہست
 گنج سخن نہ ہست بہ نہساں خانہ ضمیر
 تار و ز خاک تیرہ نہ گرد ز رشک چرخ

کہ در دے آدم آل مبار را سار باں بینی
 مگر در غارتین ہا تار و پود طلیستاں بینی
 کہ ہر جا پارہ از رخت سمجہ از دھاں بینی
 ز خون کشنہ کماں چشمہ دیگر رواں بینی
 نہ مشکش و خم بازو نہ تیرش و کماں بینی
 نو آہیں بزم طوے قائم ناشاد ماں بینی
 علی اکبر کہ بچوں بخت بد خواہش جواں بینی
 بخون آغشتہ نازک پیکر اصغر چہاں بینی
 حسین ابن علی را در شمار کشمگا ر بینی
 نہ بینی گر خود آں خواہی کہ تیش بر غار بینی
 سرے را کش ز افسر مار بودے بر سان بینی

آئین دہر نیست کہ کس را زباں دہد
 را دست را ڈا ہر چہ دہد را یگاں دہد
 درویش را اگر نہ سحر شام ناں دہد
 دانکہ کلید گنج بدست زباں دہد
 رخسانی ستارہ بدیگ رواں دہد

تا آدمی ملال نہ گیرد ز یکس ہوا
ہم در بہار گل شگفاند چمن چمن
ہم در تموز میوہ فشانند طبق طبق
اں را کہ طالع کف گنجینہ پاش نیست
اں را کہ بخت دسترس بذل مال نیست
دائم کہ آسماں بہ زمین پیشکار کیست
چوں جنبش بہر یفران داورست
زنگ از گلست و سایہ ز نخل و نواز مرغ
در شہر لغو، قزو بنام ہوا زند
ستیز باسیم، اگر بلبلے، باغ
دلرو ز بہر زندگی آمد، نہ بہر مرگ
پرویز دیر یاب شہے بود، ورنہ بخت
فریاد زود میر کے بود، ورنہ و ہر
دارم ز روزگار نویدے کہ اں نوید
از داد و زمانہ باندیشہ درست
ہر گز بسر نوشت سراید شمار غم
سلطان دیں محمد مہدی کہ راے او
صفت سالکان طریقت

تشبیب قصیدہ مدت بہادر شاہ مرحوم
رہرواں چوں گہر آبد پا بینند

سرا و نو بہار و تموز و خزاں دہد
تا راحتِ مشام و نشاطِ رواں دہد
تا آرزو کے کام و مراد دہاں دہد
طبع سخن رس و خرد خردہ داں دہد
نعم البدل ز حامد پرویں فشاں دہد
عکس چہ جلوہ روشنی روشنال دہد
بیداد نہ بود، آنچہ بسما آسماں دہد
ہر جا بہار ہر جہ بود در خور آں دہد
دہ نشو سبز، حکم بہ آب رواں دہد
جاں در نور و غار و خس آشیاں دہد
جرم پز شک چیت اگر خستہ جاں دہد
آوارہ را براہ ز شیریں نشاں دہد
کام دل غریب پس از امتحاں دہد
در پیریم بشارتِ بختِ جواں دہد
شادم کہ مزد بند گیم ناگہاں دہد
راہم بیار گاہ شہ انس و جاں دہد
منشور روشنی بشہ خاوراں دہد

پاے را پایہ قرار ز ثریا بینند

ہرچہ دیدیدہ عیالست نگاہش دارند
راستی از رقم صفحہ ہستی خوانند
یہ شعر کو یا ما حاصل ہے اس قول کا کہ "لیس فی الامکان ابداع متاکان" یعنی جو
نظام عالم کہ اب موجود ہے، اس سے بہتر نظام ناممکن تھا۔

دور بینان ازل کوری چشم بد بین
رازدیں دیدہ دریاں جوے کہ از دیدوی
راہ زیں گرم رواں پرس کہ در گرم روی
شرے را کہ بنا گاہ بدر خواہد جست
قطرہ را کہ ہر آئینہ گہر خواہد بست
شام در کو کبہ صبح، نسایاں نگرند
وحشت تفرقہ در کاخ مصور بنجید

کاخ مصور وہ محل جس کو زلیخا نے وصلِ یوسف کے لیے آراستہ کیا تھا اور
جس میں تمام سامانِ عیش و کامرانی جمع تھا۔ نے بست وہ جھوپڑا جو یوسف کے
قید ہو جانے پر ان کی جدائی کے غم میں زلیخا نے اپنے لیے بنایا تھا اور اس میں سہمی
تھی۔ کہتا ہے کہ یہ لوگ یعنی اہل اللہ کا رخ مصور جیسے آراستہ محل میں، اس تفرقہ
کی وحشت کو دیکھ لیتے ہیں جو یوسف اور زلیخا کے حق میں وہاں سے آخر کار
پیدا ہوا اور انس اور طلب کو اس نے بست میں دیکھ لیتے ہیں جو یوسف اور زلیخا
کو اس کے بعد نصیب ہونے والا تھا۔

ہرچہ گوید عجم از خسرو شیریں شنوند

ہرچہ دیدیدہ نہالست، زسیما بینند
نقش کج بر ورق صفحہ عتقا بینند
یہ شعر کو یا ما حاصل ہے اس قول کا کہ "لیس فی الامکان ابداع متاکان" یعنی جو
نظام عالم کہ اب موجود ہے، اس سے بہتر نظام ناممکن تھا۔

ہم دریں جا نگرند آنچه در آنجا بینند
نقطہ گرد نظر آرند، سویدا بینند
جادہ چوں نبض تپاں ددگ محراب بینند
زخمہ کردار بتارِ رگ خار بینند
صورتِ آبلہ بہ چہرہ دریا بینند
روز در منظرِ خفاش، ہویدا بینند
مجمع انس، نے بست زلیخا بینند

جس میں تمام سامانِ عیش و کامرانی جمع تھا۔ نے بست وہ جھوپڑا جو یوسف کے
قید ہو جانے پر ان کی جدائی کے غم میں زلیخا نے اپنے لیے بنایا تھا اور اس میں سہمی
تھی۔ کہتا ہے کہ یہ لوگ یعنی اہل اللہ کا رخ مصور جیسے آراستہ محل میں، اس تفرقہ
کی وحشت کو دیکھ لیتے ہیں جو یوسف اور زلیخا کے حق میں وہاں سے آخر کار
پیدا ہوا اور انس اور طلب کو اس نے بست میں دیکھ لیتے ہیں جو یوسف اور زلیخا
کو اس کے بعد نصیب ہونے والا تھا۔

ہرچہ آرد عرب از واقع و عذر بینند

یعنی خسرو و شیریں کا قلعہ جوابی عجم بیان کرتے ہیں، یہ لوگ خود اس کو خسرو اور شیریں کی زبان سے سن لیتے ہیں اور دامت و عذرا کی رویداد جو عرب والے بیان کرتے ہیں، یہ لوگ خود اس کو دامت و عذرا پر گزرتی دیکھ لیتے ہیں۔

نستوبند اگر ہرہ مجنوں گردند نخر و شند اگر محل یسے بیند
خون خورد و جگر از غصہ بدنداں گیرند خویش را چوں بسرماندہ تنہا بیند
یعنی جب ان کے ساتھ کوئی دوسرا دسترخوان پر نہیں ہوتا، تو دانت پیستے ہیں
یعنی جو فیض ان کو پہنچتا ہے اس میں اور دل کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔

سروتن را اگر از درد ستوہ انکارند جان و دل را اگر از دوست شکیبا بیند
قطرہ آب بہ لب پوسہ نشتر شمرند پارہ نان بگلہ ریزہ میتا بیند
یہ دونوں شعردست و گریبان میں مطلب یہ ہے کہ دردِ طلب سے اکتا جانا اور دوست کے خیال سے فارغ ہونا کبھی نہیں چاہتے۔

قشقہ را ردلق ہنگامہ ہند و خوانند بارہ را شمع طرب خانہ ترسا بیند
یعنی ہر ایک شے کو اپنے اپنے محل پر مناسب و موزوں خیال کرتے ہیں اور کسی چیز سے ازراہ تعصب تک نہیں چڑھتے۔

برسم و زمزمہ و قشقہ و زنا و صلیب خرقہ و سبجہ و مسواک و مصیٹے بیند
برسم و زمزمہ آتش پرستوں کے ساتھ، قشقہ و زنا ہندوؤں کے ساتھ، اور صلیب عیسائیوں کے ساتھ مخصوص ہے، اور دوسرے مصرعے میں شعائر اسلام کا بیان ہے۔ کہتا ہے کہ وہ لوگ برسم و زمزمہ وغیرہ اور خرقہ و مصیٹے وغیرہ میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔

طلہ نہ بندہ بیزنگ و دریں دیر و رنگ ہرچہ بیند بہ عنوان تماشا بیند
جام جویند و زندی نہ گرایند بہ زہد سبوح انجم اگر درید بیضا بیند

ہرچہ در سونہ توان یافت، بہ ہر سویا بند
ہمہ گردند دریاں پایہ کہ او را دانند
اشعارِ فخریہ

ایں نظرِ بے گرانمایہ فراموشش کنند
نظم را موجہٴ سرچشمہٴ حیاں قہمت
کہ پے نقل بصد گونہ تقاضا خواہند
بزداز یاد کہ دنیا ست نمود بے بود
اس مقام پر اس شعر کی خوبی و جدائی ہے، بیان میں نہیں آ سکتی۔ کہتا ہے کہ دنیا
کی یہ دل افروز نمود یعنی ہماری نظم و نثر جب اہل اللہ کی نظر سے گزرے گی،
تو وہ ان کے دل سے اس عارفانہ خیال کو فراموش کر دے گی کہ دنیا محض ایک
نمود بے بود ہے۔

صفتِ موسیٰ بہار

تشبیبِ قصیدہ مدحِ ملکہ معطلہ

شکر کہ آشوبِ برف و بارِ سرآمد

کسبِ ہوا نفعِ آبِ خضر رساند

یعنی آج کل جنگل کی ہوا کھانے سے وہی فائدہ ہوتا ہے، جو آبِ حیات کے
پینے سے ہوتا ہے؛ اور جس طرح خضر آبِ حیات کا رستہ بتاتا ہے، اسی طرح
سبزہ جنگل کا رستہ بتاتا ہے۔

در چمنستان کشودہ بارِ نوادر
یاد کہ بازارِ گاہِ بحر و برآمد

اشتہار انتظار گل بود، ارے دیدہ ز گیس ز حدقہ چوں بدرآمد
 تازہ دانستہ قرب مقدم گل را سبزہ بہ باغ از شکوفہ بیشتر آمد
 یعنی سبزہ جو شکوفے سے پہلے آیا ہے، اس نے گل کی آمد آمد کہاں سے سن لی۔
 بہندہ بود خردش مرغ سخنواں کوکہ عمل عملا بہ باغ درآمد
 قیس کجا تا کند شمارہ محل از پس ہر فنجہ فنجہ دگر آمد
 غنچے کو محل سے اور گل کو بیلے سے تشبیہ دی ہے۔ کہتا ہے کہ قیس جو ایک کے
 سوا دوسرا محل نہیں جانتا، وہ آئے اور محلوں کو شمار کرے کیوں کہ ہر غنچے کے بعد
 دوسرا غنچہ اور دوسرے کے بعد تیسرا و تلم جزا نکلتے چلے آتے ہیں۔
 کثرت الزارع محل ٹکڑے بیوئے رنجہ زیار فزونی صورت آمد
 یعنی طرح طرح کے پھولوں کی اس قدر کثرت ہے کہ بیوئی بے شمار مختلف صورتوں
 کی بہتات سے عاجز آگیا ہے اور ٹھک گیا ہے۔
 لالہ بسیجہ ز تیغ کوہ گزشتن رامنش اینک ز زیر سنگ برآمد
 بسیجہ یعنی ارادہ کرتا ہے۔ تیغ کوہ، قلذہ کوہ؛ رامن از زیر سنگ برآمدن مصیبت
 سے نجات پانا۔

نکبت گل شد بای عام جعل را زنجہ ہر شب نہ بہنہ موہ گرآمد
 جعل ایک جانور ہے، سیاہ رنگ جس کو خوشبو اس نہیں؛ اسی لیے موسم بہار میں
 مرجاتا ہے اور چوں کہ گوبر میں پیدا ہوتا ہے، اس لیے اس کو ہندی میں گوبر ملا
 کہتے ہیں۔ زنجہ، جھینگر جوات کو اکثر بوتا ہے۔ موہ گرانا لالہ دگر یاں۔
 میکدہ خسرو گل ست از ستا صورت میناز غورہ در نظر آمد

کہتا ہے کہ زستان یعنی انگور کی ٹٹیاں گویا خسرو گل کا شراب خانہ ہے
 کیوں کہ اس میں نیم خام انگور لگے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے شراب کی بوتلیں۔
 روغنم تر دامن مخور کہ جہاں را
 فتویٰ نے داد ابر و باد و سکین
 از تشبیب قصیدہ مدحیہ ملکہ معظمہ

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں امن ہو جانا اور معافی کا اشتہار جاری ہونا
 در روزگار ہا نتواند شمار یافت
 پر کار تیز کرد فلک در میاں میں
 خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت
 حق داد و حق کہ مرکز قرار یافت
 ہر کس ہر آنچہ جبت بہر روزگار یافت
 بر آئے خاک پیچ و خم زلف یار یافت
 پادشہ جانگدازی شہاے تار یافت
 اجر جگر خراشی پیکان عسار یافت
 ایں پردہ کش کہ خلق ز پروردگار یافت
 دد ہر ہر چہ صورت ازیں ہر چہار یافت
 ہر شے بھمن جو ہر خویش اشتہار یافت
 ہم بدر برائے خودش بندہ واریاں
 توفیق خوش حالی ز خداوندگار یافت
 لیل و نہار صورت بیل و بہار یافت
 نابید ذوق و لذت مضرب و تار یافت
 اندیشہ گنجہاے نہاں آشکار یافت

در روزگار ہا نتواند شمار یافت
 پر کار تیز کرد فلک در میاں میں
 در ہائے آسمان بہ زمین باز کرد مانند
 آمد اگر لغرض ز بالا بلا فرود
 چوں حسن ماہ یک شبہ یعنی بدایں کہ ماہ
 چوں رنگ روئے گل نگری شاد شو کہ گل
 در خاک باد آتش و آب آشتی فرود
 ناچار جزہ داد گر ایش نمی کند
 ہر کس بقدر فطرت خویش ارجمند گشت
 مگر خواجہ بندہ را خط آزادگی نبشت
 در بندہ خود خشم خط بندگی درید
 مہ روشنی و ہر فروزش از سر گرفت
 بہرام دل بہ بستن تیغ و کمر نہاد
 نظارہ فتنہ ہائے عیاں از نظر ستود

جام از شراب موشنی آفتاب داد
روئے سخن صفائے بنا گوش گل گزید
بر ہم زند قاصدہ پائے کہن بہ دہر
فیض سحر، فائز پیمان کش رسید
ربین سارع خویش بر این السبیل ریخت
مگر ز اہدست نیز ز من نے بکام برد
باختہ ہم مضائقہ در ختمی نرفت
دولت پسند سوخت کہ شد ملک تازہ روئے
از انتظام شاہی و آئین سرودی
بر خستہ گاہ بند بہ بخشود از کرم

ہزم از بساط تازگی نو بہاریانت
باہم قلم نشاط نوائے ہزار یانت
ہر کس نشاط تازہ ز ہر گونہ کاریانت
ذوق صبح عالیہ شب زندہ داریانت
کو دک رضاے لہوز آموز گاریانت
در مجرم ست نیز ز شہ زینب یاریانت
خود رخت خواہش اندک گل لعل و تازیانت
ملک آفریں سرود کہ دولت مداریانت
شود سرود و دانش و داراقت یاریانت
دکنوریا کہ رونق از روز گاریانت

شکوہ تعادل و عدم توجہ نواب یوسف علی خان مرحوم رئیس رامپور در زمانہ سختی و بے یارگی
کہ بعد از فتح دہلی روزی چند زعمے دارہ بود

چون نیست مرا شربت آبے ز تو حاصل
در باد یہ بر گور غسریاں ز چہ سوزد
زان خسرو خواباں چہ قدر چشم و نا بود
دائیم کہ تو دریائی و من سبز و ساحل
آن شمع فروزاں کہ بود در خور محفل
مدحیہ کہ شد نقش امیدم ہمہ باطل

۱۔ بیل ۲ یعنی من ۳ نواب یوسف علی خان مرحوم صاحب زادگی کے زمانے میں جب تحصیل علم کے
پے دلی میں آئے تھے اس وقت مرزا صاحب سے بہت ربط تھا مفتی صدر الدین خان مرحوم سے عربی پڑھنے تھے
اور مرزا صاحب سے فدری مرزا نے اس قصیدے میں اس زمانے کو یاد دلایا ہے۔ چنانچہ اسی قصیدے پر نواب
ممدوح نے سورہ ہیرا بجا کر مرزا کے لیے مقرر فرمایا تھا جو مرزا کے دم داپس تک برابر جاری رہا۔

افسانہ و غم گر بسرایم، نہ بود عیب
 سیکویم و ہمدم زندم طعنہ کہ تن زن
 از طعنہ شدم خستہ دل و از رو بیمار
 تا کس نہ بدظن کہ بہ شاہد بودم رُوسے
 شاہد بود آن دوست کہ اندر غزل ادا
 من مالم از آن دوست کہ در عالم انصاف
 او خسرو خواباں بود و بندہ گدایش
 خود ہر چہ سرودم ہمہ با دوست کزین پیش
 یارب! چہ شد اینک کہ نگیرد خبر از من
 اے یوسف ثانی کہ بود در ہمہ عالم
 تا نزد تو چوں آیم و دور از تو چہ سلام
 اے کاش! بگوئے تو چہ نہیں رُوسے نمودے
 چون ست کہ گاہے نکنی رُوسے بدیں شوے؟
 گر جاں دہم از غصہ تو دانی کہ بگیتی
 خواہی کہ مرا بگری، از دور بفرماے
 از صنعت استادِ ازل داں کہ ز ہر سوے

با دوست کہ پیوستہ ہمی بُرد غم از دل
 چوں می نہ ہر داد از فریاد چہ حاصل
 دل گفتم کہ ہاں، شبیہ عشاق فردل
 عاشاکہ حکایت کنم از لیلی و محمل
 خواندستم گارہ خو بخوارہ و قاتل
 شایاں بودش، گویم اگر، خسرو عادل
 او قلم و عمان بود و من خیر سائل
 امیدگم بود بہ ہر وادی و منزل
 بر بستہ برویم در ارسالِ رسائل
 مشتاقِ جمال تو چہ دیوانہ، چہ عاقل
 ماندن ز تو دشوار و رسیدن بہ تو مشکل
 زمینیاں کہ فرو رفتہ مرا پای دریں گل
 از چہیت کہ ہرگز نہ وہی دایہ بسائل
 حرفے غلط از صفو ہستی شدہ زائل
 تا نزد تو آرند یکے طائرِ بسمل
 چوں قبلہ نما شوے تو ام ساختہ نائل

۱ خاموش باش ۲ غم خواری ۳ یعنی رُوسے سخن

۴ چوں کہ تشبیب میں اکثر معشوق کی طرف خطاب ہوتا ہے اس لیے کہتا ہے کہ میں اس تشبیب میں لیلی و محمل کا ذکر نہیں کرتا یعنی معشوق کی طرف میرا رُوسے سخن نہیں ہے۔

۵ یعنی از تقاسے تو و مانند ۶ یعنی دردِ وطن خود ۷ در پوزہ

غالب بسخن نام من آمد، ازل آودا
 در فن سخن دم وزن از عرفی و طالب
 من گنج و گردوں ز گل اندوده دم را
 خود در خور ویرانه بود، گنج گراں مند
 ہاروت، فسون، نفس گرم چہ داند
 آن را کہ صریر قلم پوشش ربايد
 تویح بر تلای بہ تو فرخندہ کہ من نیز
 عاشاکہ ستانم رقم قاضی و مفتی
 بفرست خردمند کساں را بحکومت
 ہر سال ازاں شہر بمن وایہ رواں دار
 امید کہ لب تشنگی من نہ پسندی
 زان رشو یعنی مادر، مطلب یہ کہ میرے ساتھ خط و کتابت جاری رہے۔

امید کہ ہزیری و بر من نہ کنی تہہ
 امید کہ اس شیوہ نوری کہ گویم
 کیفیت آغاز موعوم سرا

تشبیب قصیدہ مدح نواب وزیر الدولہ رئیس ٹونک
 عید اٹھنے بسرا آغاز مستان آمد
 گرمی از آب بروں رفت و حرارت زہوا

دانی کہ دریں شیوہ نیم عامی و جاہل
 اس آیہ خاص ست کہ بر من شدہ نازل
 می ہیں در گنج، ارچہ کشودن شدہ مشکل
 غم نیست گر آبادی دہلی شدہ زائل
 اعجاز دہلی بود و سحر ز بابل
 دیگر بزد ذوق ز آواز عنادل
 بستم بہ فرہ مندی خویش از کرمت دل
 عاشاکہ پذیرم عمل شحتہ و عامل
 در جیب گدا ریز قلیے ز مداخل
 کز ہر ہمیں گشتہ در اقطاع تو شامل
 زان رشو کہ بر صفو فشان ز اتامل

نپذیرم اگر معذرت فرط مشاغل
 کز درد دلم فارغ و از من شدہ غافل

وقت آراستن حجرہ و ایوان آمد
 محفل ہر جہان تاب پیسزاں آمد

۱ یعنی قدیم و ازل ۲ یعنی میرے در کو تینا کر دیا ہے ۳ گنج گراں بہا ۴ یعنی زبان الحاق بریلی
 پراپور ۵ اقبال مندی ۶ یعنی عہدہ قاضی و مفتی نیخواہم ۷ یعنی از حاصلات بریلی ۸ جاگیر

روز می کا بد و شب راست در افزایش رو
آذر افروز و خرد اطلس و سیف و بدو
ہند در فصل خزاں نیز بہارے دارد
وے و بہمن کہ در اقلیم دگر تیغ بند
نیشکر بسکہ صفت آراستہ کد پور نسیم
نخل نارنج نہ بینی کہ ہم از میوہ و شاخ
تا برد و اریغ غم بحر شقائق ز دلش
گر نہ این گرمی ہنگامہ تماشا دارد
صفت و حکم بہار

تشبیب قصیدہ مدحیہ زندہ سنگہ سرگبانی رئیس پٹیاہ

سحر کہ بادِ سحر عرضِ بوستان گیرد
براثِ برزخِ گل کردہ اندامنداری
مگر بگر ذل از بہر پاشِ حلقہ زدہ است
ستادہ سرو بباں اہتمام بر درِ باغ
ز ژالہ غنچہ بہ سرمست شاہدے ماند
چمن ز عکسِ شفق سا تکمین مثل گردد
زندہ گر ہمہ آتش بہ غار، گل بالہ
ز انبساطِ ہوا بعد ازین عجب دارم

موسم دیر غنودن بہ شبستان آمد
مہر مہ میرود، اینک مہ آباں آمد
گونہ گون سبزہ کلی بندہ خیاباں آمد
اندریں ملک گل و سبزہ فراواں آمد
گفت مانیت دگر سرزادہ نتوان آمد
گوی چو گاہ بکفت آورد و بیدار آمد
گل صد برگ بد لہجہ و بیہقاں آمد
از چہ زنگس پے نظارہ بہ بستان آمد

وہد بہ نکہتِ گل حکم تا جہاں گیرد
کہ غنچہ را سپر سبزہ در میاں گیرد
کہ ژالہ را ز ہوا سبزہ بر سناں گیرد
کہ تا بہار دگر راہ بر خنزاں گیرد
کہ بعد بادہ شکر ریزہ در وہاں گیرد
سمن ز جوشِ طرب زنگِ ارغواں گیرد
کشند گر ہمہ پیکر ز سنگ جہاں گیرد
کہ مرغ قبلہ نما جا در آشتیاں گیرد

۱ یعنی در وے و بہمن ۲ باغبان و کاشتکار ۳ یعنی دانا یا منہ اٹھائے ۴ لاہ ۵ گیندا

۶ تنخواہ کی چٹی ۷ محافظت ۸ مسدود سازند ۹ یعنی از آشتیاں پرواز خواہد گیرد

اگر زما نتواند از دل سستاں گیرد
کہ شیخ شہر چو ما ترکِ خسان و ماں گیرد
چو آن گدائے کہ دنبال کارواں گیرد
چرا کسے مٹراں دستِ باغبان گیرد

ز گل نگہ نتوان داشت دل، بکشد عشق
چنان بکینج چمن یافت ذوقِ طاعتِ حق
حرلیں جلوہ، نگہ در باجم لالہ و گل
چنین کہ شاخ ہی سینہ بر زمیں مالہ
کیفیت صبح

تشبیب قصیدہ منقبت حضرت امیر
صبحی کہ در ہولے پرستاری و شن
در رفت و روپ دیر دم گرم راسپاں
خیزند دستہ دستہ مغان نشستہ روے
از شورِ دیریاں بگمانِ خروشِ نمود
رخشد ستارہ از رخِ ناستہ، صنم
بر روے خاک جلوہ کند سایہ در نظر
خواہد چراغ کشتہ چو شخصِ بربیدہ سر
بر جامِ گل ز دیدہ شبہم چکد نگاہ
غوغائے روز پردہ کشاید ز خوب زشت

جنبہ کلید بتکرہ در دستِ برہمن
آرد برون گداختہ شمع از لکن
در آرزوی چیدن برسم ز ناردن
اموات را ز رقص بہ تن بردگ کفن
بالد بنفشہ از قدیم گشتہ شمن
بر لبے دوست حلقہ زند مرغ در چمن
خیزد گل شکفتہ چو رنجور خستہ تن
بر روی گل زطرہ سفیل دود شکن
آولے کوس خواب ربا بد ز مردوزن

فخر و خود ستائی باشکوہ بخت و گردوں

اس مضمون کے کچھ متفرق اشعار ہم مرزا کے ایک ترکیب بند میں سے جو جناب امیر کی منقبت

۱ بیت ۲ گروہ کردہ ۳ برسم جھلویا انار وغیرہ کی پتلی پتلی بالشت بھر کی شاخین جن کو آتش پرست
غسل یا طعام کے وقت ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ ۴ یعنی دیدہ شود ۵ شمن، بیت

میں لکھا گیا ہے نقل کرتے ہیں۔ چوں کہ یہ نظم ایک خاص انداز کی منقبت اور خاص طرز کی شاعری پر مبنی ہے جس سے زمانہ، حال کے عام مذاق نا آشنا ہیں؛ مگر باوجود اس کے مرزا کے کلام میں شاعری کی حیثیت سے نہایت ممتاز درجہ رکھتی ہے، اس لیے نہ اس کو اس موقع پر بالکل قلم انداز کیا جاسکتا ہے، اور نہ اول سے آخر تک نقل کی جاسکتی ہے۔ لہذا متعدد بندوں میں سے جستہ جستہ اشعار متضمن مضمون مندرجہ عنوان انتخاب کر کے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں اور جہاں جہاں ضرورت ہوگی، مشکل مقامات کی شرح بھی کی جائے گی۔

بند اول

اَل سحر خیزم کہ مراد رشتہاں دیدہ ام شب نشیناں رادیں گزندہ ایوان دیدہ ام
اس تمام بند میں مرزا نے اپنی سحر خیزی اور جو کچھ اس نور ظہور کے وقت آسمان پر یا زمین پر نظر آیا ہے، اس کو بلیغ و جزیل اشعار میں بیان کیا ہے اور آخر کو اس سے ایک لطیف نتیجہ نکال کر شکایت آمیز فقر پر بند کو ختم کیا ہے۔ شعر مذکور کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ سحر خیز ہوں کہ میں نے چاند کو اس کی خواب گاہ میں دیکھا ہے اور شب بیداروں، یعنی کو اکب یا ملائک کو اس گردندہ ایوان (یعنی آسمان) میں مشاہدہ کیا ہے۔

اینست خلوتخانہ روحانیاں بکاخ نازدو زہرہ را اندر دلے نور عریاں دیدہ ام
اینست کلمہ تحسین و تعجب ہے بمعنی زہرہ و خیمہ۔ روحانیاں فرشتے۔ آسمان کو کہتا ہے کہ کیا عمدہ خلوتخانہ روحانیوں کا ہے، جہاں میں نے دور سے یعنی زمین پر۔ سے زہرہ کو چادر نور میں عریاں یعنی بغیر کسی حجاب کے دیکھا ہے۔

ہریکے فارغ ز غر و ہریکے ناراں بخوش لویے را بدو عشرتنگ دوہاں دیدہ ام
ہرگز اے ناداں! بر سوائی نہ بندی دل سخن ماہ رادر ثور و کیواں را بمیزاں دیدہ ام

ان دونوں شعروں کا سمجھنا کسی قدر نجوم کی اصطلاحات جاننے پر موقوف ہے۔
 منجموں نے دورِ فلک کو بارہ حصوں میں تقسیم کیا ہے، جن میں سے ہر ایک حصے کو برج
 کہتے ہیں اور ان کے نام یہ ہیں: حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان،
 عقرب، قوس، جدی، دلو، حوت۔ ان میں سے ہر ایک برج کسی نہ کسی سیارے
 کا خانہ کہلاتا ہے یا وبال۔ مثلاً جدی و دلو زحل کے خانے اور شمس و قمر کے
 وبال ہیں، اور برعکس اس کے اسد و سرطان شمس و قمر کے خانے اور زحل کے
 وبال ہیں۔ اسی طرح ہر برج ایک سیارے کا خانہ اور دوسرے کا وبال ہے۔
 ثور اور میزان جن کا دوسرے شعریں نام آیا ہے، یہ دونوں زہرہ کے خانے ہیں۔
 اور ثور کے تین درجے چاند کے شرف اور میزان کے اکیس درجے زحل کے شرف
 کے مقام ہیں۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے چاند کو اس کے شرف کے مقام
 (یعنی ثور) میں دیکھا اور کیوان یعنی زحل کو اس کے شرف کے مقام (یعنی میزان)
 میں دیکھا، اور چون کہ ثور اور میزان زہرہ کے خانے ہیں، اس لیے اس مطلب
 کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ میں نے ایک لڑکی (رندھی) یعنی زہرہ کی دو عشرت گاہوں
 یعنی ثور و میزان میں دو ایسے مہمان دیکھے ہیں کہ ہر ایک دوسرے کے حال سے
 بے خبر اور ہر ایک اپنے حال میں خوش ہے کہ میرے سوا کوئی دوسرا زہرہ کی عشرت گاہ
 میں نہیں ہے۔ پھر دوسرے شعریں دفع دخل مقدر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس
 بیان کو کسی بُرے معنی پر محمول نہ کرنا چاہیے، بلکہ صرف مطلب یہ ہے کہ میں نے ماہ
 کو ثور میں اور زحل کو میزان میں دیکھا ہے۔

رفتہ امزاں پس بسیر باغ و مرغیاں یا باغ سر برسم خواب زیرِ بال پنہاں دیدہ ام
 برسم خواب یعنی جیسا کہ پرندوں کے سونے کا دستور ہے۔ سر زیرِ بال پنہاں یعنی
 بازو تیلے سر گھسائے ہوئے۔

کھلک موج نکبت گل دم ز گردش نا زده نامہ فیض سحر نوشتہ عنوان دیدہ ام
 موج نکبت گل کو کھلک یعنی قلم قرار دیا ہے اور فیض سحر کو نامہ یعنی خط ٹھہرایا ہے
 کہتا ہے کہ ایسا سویرا تھا کہ پھولوں کی خوشبو کا قلم ابھی گردش میں نہیں آیا تھا کہ میں
 نے فیض سحر کا مکتوب جب کہ اُس کا سرِ نالہ نہیں لکھا گیا تھا، دیکھا۔ مطلب یہ کہ
 فیض سحر ابھی عام نہ ہوا تھا اور پھولوں کی خوشبو سے باغ مہکنے نہیں پایا تھا۔
 شانہ باد سحر گاہی یہ جنبش نامہ طرہ سنبل بیالیں بزر پریشاں دیدہ ام
 اس بیت میں باد سحر گاہی کو کنگسی فرمن کیا ہے جس کے ملامت جھونکوں سے گویا
 سنبل کی زلف سلجھ جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ابھی شانہ نسیم صبح کو جنبش نہیں ہوئی
 تھی اور طرہ سنبل بالین راحت پر پریشان پڑا ہوا تھا۔

باد سرستانہ می جنبید و شبہم می چکید غنچہ را در رخت خواب آلودہ دامن دیدہ ام
 یہ اس حالت کے بعد کا بیان ہے جو پہلے دو شعروں میں بیان ہوئی ہے۔ کہتا ہے
 کہ ہوا رساں رساں چل رہی تھی اور شبہم ٹپک رہی تھی جس کی وجہ سے میں نے
 غنچہ کو رخت خواب میں آلودہ دامن دیکھا، یعنی اگرچہ غنچہ ابھی دوشیزگی کی حالت
 میں معلوم ہوتا تھا، مگر چوں کہ وہ عنقریب کھلنے والا تھا اس لیے وہ گویا اپنے رخت
 خواب میں آلودہ دامن ہو چکا تھا۔

صبح اول گویا روئے کس نہاورد از حیا صبح ثانی را بریں ہنگامہ فنداں دیدہ ام
 اب ان تمام عجائبات کی جو آخر شب اُس کو نظر آئے ان کی قلعی کھوت ہے اور کہتا
 ہے کہ صبح اول (یعنی صبح کاذب جو گویا شرم و حجاب سے ایک مہلکی دکھا کر غائب
 ہو جاتی ہے) اگرچہ وہ حیا سے اصل بھید منہ پر نہیں لاتی مگر صبح ثانی یعنی صبح صادق
 کو میں نے اس تمام ہنگامے پر خندہ زن دیکھا۔ مطلب یہ کہ یہ تمام نظر فریب سیمائی
 جلوے تھے، جن کو محض وہم نے اختراع کیا تھا اور اسی لیے صبح صادق ان پر خندہ زن

تھی۔ اس کے بعد بند کو اس گروہ کے شعریہ ختم کرتا ہے اور کہتا ہے:

محرم رازِ نہایت روزگارم کردہ اند تا بحرِ فہم گوشِ تنہد خلق، خوارم کردہ اند
کہتا ہے کہ اگرچہ مجھ کو زمانے کے پوشیدہ اسرار کا محرم بنایا ہے، مگر اس لیے کہ
کوئی میری بات نہ سنے اور پوشیدہ راز ظاہر نہ ہونے پائیں، مجھ کو دنیا میں ذلیل
خوار کر دیا ہے۔

از بندِ سوم

روشناس چرخِ دزد جمع اسیرانش منم نورِ چشمِ روزنِ دیوارِ زندانش منم
کہتا ہے کہ آسمان کے مظلوم اسیروں میں اس کا روشناس اور پہچاننے والا صرف
میں ہوں۔ گویا میں اُس زندان کے روزنِ دیوار کی، جس میں آسمان کے مظلوم
قیدی اسیر ہیں، آنکھ کا نور ہوں۔

ثابت و سیارِ گردوں رازِ مدبستم نہ علم رشتہ تسبیح گو ہر ہائے غلطانش منم
چوں کہ رُصد باندھنے سے اکثر ستارے منتظم ہو جاتے ہیں، اس لیے کہتا ہے کہ
میں نے جو آسمان کے ثواب و سیارات کی رُصد باندھی ہے، تو گویا میں اس کے
گوہر ہائے غلطاں (یعنی کوکب) کی تسبیح کا ڈورا ہوں جس کے سبب سے تمام
ستارے مثلِ دانہ ہائے تسبیح کے منتظم ہو گئے ہیں۔

نے زندانش کا میاب و نہ بہ سختی تنگدل شمسارِ کوششِ برجیس و کیوانش منم
اہلِ نجوم کے نزدیک برجیس یعنی مشتری علم کا اضافہ کرنے والا ہے، اور کیواں
یعنی زحل سختی اور مصیبت کا بھیجئے والا ہے۔ کہتا ہے کہ میں علم سے کامیاب
ہوں اور نہ سختی و مصیبت سے گھبرانے والا ہوں۔ تو گویا مشتری اور زحل دونوں
کی کوششیں میرے باب میں رائیگاں جاتی ہیں اور اس لیے میں ان دونوں سے
شرمندہ ہوں۔

در لیٹھی شہرہ دہراز تہی دستیت چرخ رفتہ مسکین راز یاد و گنج پنہا نش منم
 کہتا ہے کہ آسمان جو لیٹھی اور بخل میں مشہور ہے، یہ اس کی تہی دستی کا نتیجہ ہے،
 کیوں کہ اس کے پاس دینے کو کچھ باقی نہیں، وجہ یہ کہ اس کا گنجینہ پنہاں میں تھا، سو
 وہ اپنے خزانے کو یعنی مجھ کو بھول گیا ہے۔ مسکین سے مراد خود آسمان ہے ایسے
 اردو میں کہتے ہیں کہ غریب اپنا خزانہ کہیں رکھ کر بھول گیا۔

در غریبی خویش را از فقرہ در دل می علم خوردہ ام از شست غم تیرے کہ پیکانش منم
 یعنی عالم غربت میں بسبب غم کے میں خود اپنے دل میں چھتا ہوں گویا غم کی چٹکی
 سے وہ تیرے میرے آکر لگا ہے کہ خود میں ہی اس تیر کی بھال ہوں۔

ماندہ ام تنہا گنج از رو رہا بش پاس وضع خانہ دارم کہ پندارند در بانس منم
 دور رہا بش ہٹو بڑھو کی آواز کو کہتے ہیں جو نقیب، اراد و سلاطین کی سواری کے آگے
 آگے پکارتے جاتے ہیں۔ مگر شواہد کو اکثر مطلق روک ٹوک اور ممانعت و مزاحمت
 کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ کہتا ہے کہ پاس وضع مجھ کو گھر کے کونے سے
 کہیں باہر نہیں جانے دیتا۔ پس میری اپنے گھر پر ایسی مثال ہے کہ گویا اس کا
 دربان میں ہی ہوں۔

پایہ من جز بہ چشم من نیاید در نظر از بندہ ی اخترم روشن نیاید در نظر
 از بندہ چہارم

چوں بغیر از عسکراں مغتت سیم مایہ نیست نبودم بیم زیاں گر چہ رخ کج باز دہمن
 بر منش دستے تواند بود زان بالا ترم دل بتازم شیر گردوں پنجه گر باز دہمن
 پہلے مصرع کی تقدیر عبارت یہ ہے: "من اتراں بالا ترم کہ فلک را بر من دستے تواند
 بود" شیر گردوں سے مراد خود گردوں یا بھج اسد یا مرتخ۔ پنجه باز دین، دست
 دراز کردن و حملہ نمودن۔ دل باختن، بدحواس شدن۔

ہر گراگردوں بلند آوازہ تر خواہد بدہر
نوبت شاہی دید و انگاہ بنواز دہمن
بنواز دہمن، یعنی اس کو میرے ذریعے سے معزز کرتا ہے۔ دوسرے شعریں اس کی
تشریح ہے۔

پادشاہاں را سخن گفتن نہ کار بہر کس ست
دیدیہ و رشاہے کہ کار گفتن انداز دہمن
وہ تو گوئی پادشاہ را ملیہ نبود، بیم نیست
خود بہ شاہاں مایہ بخشم، گر بہر دازد دہمن
آں کہ چہل در ملک ہستی سکہ شاہی زند
سکہ شاہی بطغزلے دید اللہی زند
قولا "پادشاہ را مایہ نبود" اس سے یا تو یہ مراد ہے کہ سلاطین عہد اس قند مایہ نہیں
رکھتے کہ میرے کمال کے موافق میری قدر کریں، اور یا یہ مطلب ہے کہ بہادر شاہ
مرحوم جو اُس زمانے میں مرزا کے ممدوح اور پادشاہ کے لقب سے ملقب تھے، وہ
گردش روزگار سے بے مایہ ہیں۔ قولا "گر بہر دازد دہمن" بہر دازد کا فاعل دوسری
بیت میں واقع ہوا ہے یعنی "آنکہ چوں در ملک ہستی الخ" مراد اس سے حضرت
امیر المومنین علی مرتضیٰ ہیں جن کی منقبت میں مرزا نے یہ بند لکھا ہے۔

قطعات

توجیہ توارد خود با کلام سلف
کزار معنی سر جوش، خاص نطق من ست
کز اہل ذوق دل دگویی از عمل بردست
ز رفتگان بیکے گر تواردم زوداد
مداں کہ خوبی آرایش غزل بردست
راست تنگ، ولے نواز دست کان بہ سخن
بسعی فکر رسا، جا بجاں محفل بردست
مہر گمان توارد، یقین شناس کہ دزد
تاریع من از نہاں خاند از دل بردست

رندانه

فرست اگر ت دست دہد مقتنم انگار
ز بہارہ ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند
خطاب بہ یکے مٹا افان تو نگر

اے کہ خواہی کہ بعد ازین باشم
گر ترا شیوہ شاہدی بویے
در ترا پیشہ شاعری بودے
در ترا پایہ خسروی بویے
چوں ازین ہا ہڈ، مرا چہ ضرور
راست گویم، بہانہ چند آرم
بسکہ بر مال و جاہ مغسروی
چکنی، کایں فساد سیم و زرت
بتو ہرگز ندادے زرد و سیم

خطاب بہ یکے از اواعب

دیدنی آن بدگہر و مہر و لایش بہ یزید
زانکہ او خود بسیر ابن علی تیغ نہ راند
گفتم البتہ کہ شبیر بیاں می آرد
گفت زان رُز کہ عزیزاں ہمہ مسلم بودند
خطاب بہ یکے از مخالفان خود

مکودہ جہدے کہ در دیرانی کاشانہ ام
گر بہ ہیوت راندہ باشم نکتہ ہا بر خود پیچ

ساقی و مفتی و شرابے و سرودے
حق را بہ سجودے و بنی را بہ دُردے

مخلص صادق الولائے تو، من
کردے جان و دل فداے تو، من
سودے چشم و سر بہ پایے تو، من
سفینے گوہر شنائے تو، من
کہ شوم ہرزہ مبتلاے تو، من
ناصح مشفق، برائے تو، من
نیستم خوش ازین ادائے تو، من
وائے من! اگر بوم بجائے تو، من
خواجہ اگر بودے خدائے تو، من

کہ چشم آید اگر زشت و پلیدش گویند
خواجہ از تنگ نخواہد کہ یزیدش گویند
کہ شہیدش بنویسند و سعیدش گویند
نتوان کرد گوارا کہ شہیدش گویند

چرخ در آرایش ہنگامہ عالم نہ کرد
زانکہ حرفے زانچہ گفتم، خاطر خرم نہ کرد

بیٹے از استاد دیدم ذوقی بخشید یک
 "ہمچو تو ناتاقا بے در صلب آدم دیدہ بود
 عاشق لاش بودنت در صلب آدم تہمت ست
 شوقی

ایا زباں زردہ غالب کہ از حدیقہ بخت
 چو لازم ست کہ پروردگار تادم مرگ
 چراست اینکہ نداری زرازیاء و سفید
 فتادہ در سر این رشتہ عقدہ "ورنہ
 ز چند سال برگ تو و تباهی رزق
 فرشتہ کہ وکیل ست بر خزان رزق
 دوم فرشتہ کہ یارش بخیر مقرون باد
 لطیفہ کہم از قول شاعرے نصیمین
 "اگر خداے بداند کہ زندہ تو ہنوز
 شوقی

بہ آدم زن ، بشیطاں طوق لعنت
 ولکن در اسیری طوق آدم

اب ہم مرزا کی ایک نظم کا مقابلہ دورہ اکبرنی کے ایک نہایت ممتاز اور
 نامور شاعر کے کلام کے ساتھ کرتے ہیں۔ مرزا کے قصائد و قطعات و مستطعات
 وغیرہ میں صرف ایک نظم ایسی ملی ہے جس کا مولانا نظیری نیشاپوری کی نظم سے

پیچ در سبکین نغز و زو حشت کم نہ کرد
 زان سبب ابلیس ملعون سجدہ بر آدم نہ کرد
 پیش ہر کس گفتم این اندیشہ باور ہم نہ کرد

نمیرسد ز تو خار و خنجر ز پیچ سبیل
 بود بہ رزق ضروری عباد کفیل
 چراست اینکہ نیابی براز کثیر و قلیل
 نہ مروت تو و نہ رازق العباد بخیل
 شدت حکم خود از پیشگاہ رب جلیل
 نکرد پیچ توقع بہ رزق در تعطیل
 روانداشت در اہلاک شیوہ تعجیل
 کہ در لطیفہ مراؤ را کسے نبودہ عدیل
 ہزار مشت زند بردہان عزرائیل

سپردند از رہ تکریم و تذلیل
 گراں تر آمد از طوق عزازیل

بخوبی مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ نظیری نے جلال الدین اکبر کے بیٹے سلطان مراد کا جو
 عنفوانِ شباب میں گزر گیا تھا، ایک مرثیہ ترکیب بند میں لکھا ہے، جو اس کے کلیات
 میں موجود ہے اور چوں کہ نظیری کو اس کے ساتھ نہایت خصوصیت تھی اور اس کی لٹا
 میں نظیری نے متعدد قصیدے لکھے ہیں اور گراں بہا صلے ان کے جلد و میں پائے
 ہیں اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ نظیری نے اس کا مرثیہ کمال صدقِ دل سے لکھا ہے۔
 مرزا نے بھی مرحوم بہادر شاہ کے بیٹے فرخندہ شاہ کا، جو عین نشوونما کے
 زمانے میں فوت ہو گیا تھا، مرثیہ اُسی بحر کے ترکیب بند میں لکھا ہے، جو مرزا کے
 کلیات میں موجود ہے۔ چوں کہ دونوں ترکیب بند تمپوری شہزادوں کے مرثیے ہیں لکھے
 گئے ہیں اور دونوں کا وزن متحد ہے اور ہر ایک میں سات سات بند اور ہر ایک
 بند آٹھ آٹھ بیت کا ہے اس لیے ہم یہ دونوں نظمیں مقابل میں دیتے ہیں تاکہ
 ہر شخص جو فارسی شاعری کا مذاق صحیح رکھتا ہے، دونوں میں یاسانی موازنہ کر سکے۔
 مگر افسوس کہ کلیاتِ نظیری کا کوئی صحیح نسخہ ہم کو دستیاب نہیں ہوا۔ لہذا جیسا کہ لکھا
 ہوا پایا، نقل کر دیا گیا ہے چنانچہ پہلے بند کے بعض شعر بالکل سمجھ میں نہیں آئے
 جن کی نسبت ظن غالب یہ ہے کہ ان میں کتابت کی غلطی رہ گئی ہے۔

بند اول

غالب

نظیری

لب خوش نگشتہ، خندہ رہ چنگ میزند
 در بزم مرگ خندہ بر آہنگ میزند
 ہرگز زمانہ، جامہ ماتم بروں نہ کرد
 نافرقتہ شب بیدار میں شب چنگ میزند
 وقت گذشتہ را بہ تاسف زپے مرو

سے دل! بچشم زخمِ حوادث نگار شو
 سے چشم! از تراویش دل اشکبار شو
 سے خوں! بدیدہ دیدگدازِ جگر فرست
 سے دم! بسینہ دودِ چراغِ مزار شو
 سے لب! بنوحہ ناله جانکاه سازد

اے سر! بغضہ خاک سر رکھزار شو
 اے خاک! چرخ گرتواں زرد از جاد آے
 اے چرخ! خاک گرتواں شد غبار شو
 اے نو بہار! چوں تن بسمل، بخوں بغلط
 اے روزگار! چوں شب بے ماہ تار شو
 اے ماہتاب! روی پسیلی کیودکن
 اے آفتاب! راغ دل و روزگار شو
 اے فتنہ! باد صبح وزید، اینقدر محسب
 اے رستخیز! وقت رسید، آشکار شو
 آہ! ایں چسپیل بود کہ مار از سرگزشت
 تنہا ز سرگو کہ ز دیوار و درگزشت
 مرزا کے بند میں الفاظ بہت بد شکوت و شاندار واقع ہوئے ہیں اور کوئی شعر صنعت
 شاعری اور شاعرانہ نزاکت سے خالی نہیں ہے، مگر واقع کی عظمت جس قدر کہ بیان
 ہونی چاہیے تھی، اس سے براتب زیادہ ظاہر کی گئی ہے، بخلاف نظیری کے کہ
 اس کا بیان اگرچہ روکھا پھیکا معلوم ہوتا ہے، مگر متانت و اعتدال کا سرشتہ
 اس نے کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

بند دوم

غالب

بگذر کہ بر من و تو جفا کرد روزگار
 با پادشاہ عہد چہا کرد روزگار

نظیری

آفاق پر دلیغ و جہاں پر زامت ست
 ایں روز مرگ نیست کہ روز قیامت ست

شاہ سخن سراے سخنور نواز را
 در بزم عیش نوحہ سرا کرد روزگار
 شاخے کہ بود موسم آتش کہ بردہ
 از نخل عمر شاہ مجدا کرد روزگار
 مرگ اینچنین رخ و تن نازک ندیدہ بود
 کام اجل بہ ہدیہ روا کرد روزگار
 شہزادہ خرد سال و بود روزگار پیر
 شوخی بشاہزادہ چہرا کرد روزگار
 فرزند پادشہ نشناسد معانقہ
 آغوش گور بہر چہ وا کرد روزگار
 اے آن کساں کہ خاک رہ شہر یار را
 توجیہ آبروے شما کرد روزگار
 ہر چند بے اجل نتوان پیچ گاہ مہر
 آتش بخود زبید کہ فرختہ شاہ مرد
 یہ دونوں بند سادگی اور مثبت میں تقریباً برابر برابر ہیں، البتہ نظیری کے بند کا
 جو کما شعر جس رتبہ کا ہے ایسا کوئی شعر غالب کے بند میں نہیں ہے۔

بند سوم

غالب

اے قوم! خویش را بشکیب امتحاں کنید
 ایسا کار را بشیوہ کار آگہاں کنید

نظیری

اے بزم تیرہ! سخ چوں ارغواں کجاست
 وے دلم درہمی! شبہ گیتی ستاں کجاست

طفل ست شاہزادہ و درہ طلب ست
 منعی ز عزیم رہوی آن چہ ن کنید
 از مودہ و گل آنچہ دلش خواہد، آن دہید
 از حیلہ آنچہ راے شما باشد، آن کنید
 ہر حرب و لشب کہ بگوئید و نشود
 آن گفتہ را بعریدہ خاطر نشان کنید
 در خود ز رفتنش نہوانید بازداشت
 بخود شوید، جامہ درید و فغاں کنید
 گیرید و شنید و کف و ہم بر جگر زنید
 تا سببہ را ز دیدہ فزوں خوچکاں کنید
 ز نہار ہمیش شاہ گوئید و بے خبر
 تا بوت را بجانب مرقدر و اں کنید
 لے اہل شہر! مدفن این دودماں کجاست؟
 خاک بفرق، خواب گہ خسرواں کجاست؟

شوقِ سجود و حرمتِ تعظیم کمتر ست
 آن نازِ صید و سرکشیِ آستان کجاست
 امروز غم پرستند شاہی نشستہ است
 پہلو نشین خسرو ہندوستان کجاست
 آن حکما کہ بود از د آب کار کو
 و اں کار ہا کہ آمد از بوی جہاں کجاست
 دہا پر از غم ست، عزیزاں! چہ واقع ست
 یک دل شکستہ نیست، خوشی در جہاں کجاست
 ہر جا بسوگِ برگ گروہے نشستہ اند
 زیں غم کہ عام گشت اندانم، اماں کجاست
 برگ و شکوفہ ریخت، ثمر از کجا خورم
 بشکست شاخ و برگ، مرا اشیائ کجاست
 کس را سرود در خور این تعزیت نہ بود
 پیدا کنید کا قول این داستان کجاست
 خلق بشیون اند و بگویند حال چیست
 صبر سخن شنیدن و تابِ بیاں کجاست
 آفاق در مصیبت او ممکن شدہ
 ایں مرگ باعث الم مرد و زن شدہ

اس بند میں نظیری نے برخلاف پہلے بندوں کے دو شعر زیادہ کر دیے ہیں۔
 نظیری کا بند بلاغت میں شاید مرزا کے بند سے کسی قدر فائق ہو، مگر مرزا کے
 بین نہایت دھڑا شش ہیں۔ متوفی کی نسبت یہ کہنا کہ وہ کم عمر اور ناتجربہ کار ہو کا

ہے اور راہ میں بہت خطرے ہیں، اس کو جانے سے روکو اور وہ جو کچھ مانگے اس کو دو اور جو بہانہ مناسب سمجھو، وہ کرو اور اگر سیدھی طرح کہنا نہ مانے، تو اس کو سختی سے سمجھاؤ اور اگر یوں بھی کام نہ نکلتے، تو روؤ اور پیٹو اور کپڑے پھاڑو اور چٹاں کرو اور چٹیں کرو اور بادشاہ کو اطلاع کیے بغیر تابوتِ مرقد میں لے جاؤ، یہ تمام پیرایے بیان کے نہایت موثر اور دلخراش ہیں، اور مگر وہ کاشغر سارے بند کا پنجوڑ ہے۔

بند چہارم

غالب

نظیری

ز اں سبز خط کہ بر رخ اوند سپید ماند
گرے بدلِ نشت و غبارے بدیدہ ماند
بستانیاں بہا تم شہزادہ بخود اند
زیں رُو بود کہ پیر بہن گل دریدہ ماند
خون گشت موردل و جگر دوستان قتال
اں بارہ ہاے ناب کزونا کشیدہ ماند
در مدح شاہزادہ سخن ہاے دلپذیر
در را کہ ہم نگفتہ و ہم ناشنیدہ ماند
در وادی عدم نہ توان رفت با حشم
ماند آنچہ بود و صاحب عالم جبریدہ ماند
ز اں گلنے کہ صرصر مرگش ز پانگند
خارے بیادگار بدلہا خلیہ ماند
اخلاق شاہزادہ بود و منشین خلق
بوسے از اں شگفتہ گل نور سید ماند

غم غاست، دہ پیالہ کے از ساغر افکنید
شد بزم تیرہ، پردہ از اں رخ بر افکنید
شمع کہ دہر روشن از لبود، مردہ است
پروانہ را بریدہ بہ خاکستر افکنید
در خانہ اش ز حلقہ ماتم خرام نیست
اں حلقہ را ز صحن سرا بردہ افکنید
رسمان جلوہ یا سمن عشوہ ریختہ
چنید و ہم برآں قد جاں پرور افکنید
بایں ز تاب کا کش آشفگل کشید
کوثر کنید غریبہ در کشور افکنید
رفت اں سرے کہ تاج با و سر فراز بود
بر سر کنید خاک و کلاہ از سر افکنید
پوشیدہ چند جامہ نیلی ز جوہر پرغ
بر آفتاب جامہ نیلوفر افکنید

آں سرو سایہ رار کہ بارشش بود، کو؟
 وائ نو گیل شگفتہ کہ غارشش بود، کو؟
 اس بند میں مرزا کا بیان صفائی اور سادگی اور لطافت میں نظیری کے بیان
 سے سفت لے گیا ہے، جیسا کہ اصحاب ذوق پر پوشیدہ نہیں ہے۔

بند پنجم

غالب

نظیری

رفتی و کار با ہمہ در ہم گذاشتی
 آشفنگی بہ مردم عالم گذاشتی
 جانہاے غم رسیدہ و دلہاے بیقرار
 در پیچ و تاب طرۂ پر خم گذاشتی
 از تو غبار بر دل بیگانہ زد بود
 بہر چہ بر دل پدر این غم گذاشتی
 رفت و شبست بر سم جنیت ستارہ بود
 در زین خویش اشہب و ادم گذاشتی
 شمع مزار و خشت لحد ساختی قبول
 رخسار تخت و طستہ پرچم گذاشتی
 ہمت ترا بہ ملک نیادد مرفرو
 عالم بہر کہ خواست مسلم گذاشتی

دستہ ست اے سپہرا ترا دستمگی
 بارے بزم ز جور تو پیش کہ داری
 نیزنگ ساز چرخ کہ بیداد خوے اوست
 با گل کند سمومی و با شاخ مصری
 را غم ز رفتگار کہ شہزادہ بر خورد
 از خوبی و جوانی و فرزند گوہری
 جیف ست مرنش کہ در ایام کودکی
 بود اوستاد قاعدہ بندہ پردی
 شہ دودہ و دوسا لگیش کردہ کہ خدا
 با فتر خسروانی و فرتاب قیصری
 ناگاہ روز نامہ عمرش دریدہ شد
 امضا پذیر نا شدہ تو قیج شومہری

۱ غم

۲ یعنی بجا نگہ

جز نو عروس صاحبِ عالم نیافتند
دوشیزہ کہ بیوہ کنندش بدختری
زیبائی و جوانی فرخندہ شاہ جیت!
اے نونہال سروقہ کجکلاہ، جیت!
اگرچہ یہ دونوں بند اپنی اپنی جگہ تہایتِ بلوغ ہیں، مگر متانت و جزالت کے
لحاظ سے نظیری کا پتہ غالب معلوم ہوتا ہے۔

بند ششم

غالب

نظیری

اے رہ نورِ عالم بالا! چسگو نہ
مابے تو دریا سیم، تو بے ما چسگو نہ
از سایہ در غم تو سیہ پوش شد ہما
اے خفتہ دلشمنِ عنقا! چسگو نہ
زاں پس کہ با تو آب و ہوا جہاں ساخت
در روضہ جناں بہ تماشا چسگو نہ
با گلرخانِ دہر و فائے نداشتی
با حوریانِ آئینہ سیم، چسگو نہ
مابے خوداں بخلق دما تم نشستہ ایم
از خویش تن بگوے کہ تنہا چسگو نہ
بے مطرب و ندیم و غلامانِ خرد سال
بے بلغ و قلع و لب دریا چسگو نہ
بعد از تو شاہ خیل ترا برقرار داشت

حسرت نگاہداشتی و بے خویشی را
بہر برادرانِ مقدم، گزاشتی
خون ست بے تو مگر ہمہ دل چوں دل بست
ہر دل کہ بے تو خوں نشود سنگ و آہن بست
اگرچہ یہ دونوں بند اپنی اپنی جگہ تہایتِ بلوغ ہیں، مگر متانت و جزالت کے

اے شاہِ مصر! دور ز کنعاں چسگو نہ
اے یوسف! از جدائیِ خواں چسگو نہ
ہر گاہ جلوہ کردہ اتقا صا چہ می کنی
با حن شوخ در ستہ زندان چسگو نہ
اسکندر از غم تو بظلمت نشستہ است
در زیرِ گل تو چشمہ حیواں چسگو نہ
اے پارہ ز جان و جگر گوشہ پدر
گشتہ جد از دیدہ و دامان چسگو نہ
مابے از فراق تو در خون دیدہ ایم
تو در میانِ روضہ رضواں چسگو نہ
آواز لوحِ طبع و دل آشفستہ می کنہ
لے تخت خوش بخواب پریشاں چسگو نہ
ایہات کار دفتر و دیواں حوالہ بود

ایجا عزیز بوزہ، آسجا چگونہ
اسے بعد مرگ راتہ خوار تو عالے
پروانہ چرباغ مزار تو عالے

آسجا بگو زپر سش دیواں چگونہ
قلزم سبک ثبات تر آسجا ز شبنم ست
در بحر گل تو قطرہ باراں چگونہ
بشنو کہ بانگ بہر تو بر شرمی زند
تا مگریم در صف دوراں چگونہ
چوں کار رفتگان دگر نیست کار تو
محر شتاب میکند از انتظار تو

اس بند میں بھی نظیری کے ہاں دو شعر معمولی تعداد سے زیادہ ہیں۔ نظیری کا یہ بند اس کے تمام ترکیب بند کی جان ہے۔ اگرچہ مرزا کے ہاں اس بند میں نظیری کے برابر بلند شعر نہیں ہیں، مگر مرثیت کا رنگ نظیری سے بڑھ کر پایا جاتا ہے۔
بند ہفتم

نظیری

فردا کلاہ باد شہی بر سر تو باد
رسم العمل بروز جزا دقت بر تو باد
فردا کہ روز حشر بر انگیزی از زمین
دوش و کنار حور و پری محشر تو باد
روزے کہ کار با ہمہ موقوف حق شود
جبریل کار ساز و خدا باور تو باد

غالب

گفتار را بنود گری چیدہ ام اساس
در نود، شاعری کنید از من التماس
در پردہ سنجی از دم خویشم رسد گزند
درد ہروی ز سایہ خویشم بود ہر اس
من میہمان و چرخ سیہ کاسہ میزبان
دردی خور ہلاکم و تلخا بہ نوش یاس

۱۔ خاندان تیموریہ میں دستور تھا کہ خاص بادشاہ کی اولاد میں سے جب کوئی شہزادہ مرجاتا تھا تو اس کی تنخواہ اور نوکر چاکر اور اس کی سرکار بہ دستور بنی رہتی تھی۔

باقی نماندہ اشک، چہ کریم یہ ہای ہای
 اذکار رفتہ دست، چہ برتن دَرم لباس
 سر حلقہ پلاس نشینان مساکم
 اندوہ ہمدان شہ از خود نکسم قیاس
 چوں بود بزم ماتم شہزادہ بے خروش
 من دم دَرم ز تلخ نواں بریں پلاس
 از نوحہ عرض لطف سخن میتواں گرفت
 غالب سخن سرای و شہنشاہ سخن شناس
 یارب اہماں ز فیض تو بارگہ ساز باد
 عمر ابو ظفر شہ غازی دراز باد

وقت سوال گوش و لب منکر و نکیر
 پراز قبول نکتہ جان پرور تو باد
 آن عدا کہ آدم ازو ذل و قندیانت
 گر رحمت دو کون بود، در بر تو یاد
 مجموعہ عمل چو بہ محشر در آوری
 کار تو راست ہمو خط مسطر تو باد
 مغز از بخورِ روئے مزارت معطرست
 بوئے بہشت ہم نفس مجسبہ تو یاد
 آدم بہاے تو نشاندہ دریں جہاں
 تسبیح قدس در دل کان گوہر تو باد
 نخل ریاض ملک کہ باب عزیز تست
 سر سبز مازدعاے شاگستر تو باد
 کارش بہ سخن شاہد فرخندگی بود
 ہر چند بر تو مرگ، برو زندگی بود

اس بند میں بھی نظیری کے ماں دوشو معمولی تحداد سے زیادہ ہیں افسوس ہے
 کہ اس وقت کتاب کے چھپنے کی جلدی میں ہم کو اس قدر مہلت نہیں ملی کہ
 کلیاتِ نظیری کے صحیح نسخے کے ملنے کا انتظار کیا جاتا اور بعد کامل اطمینان
 کے اس ترکیب بند میں جو اشعار حل طلب تھے ان کی شرح کی جاتی جس
 سے ناظرین کو ترکیب بندوں میں موازنہ کرنے کا زیادہ موقع ملتا۔ لیکن ہمارا

ارادہ ہے کہ اس کتاب کے دوبارہ چھپنے کی نوبت آئی، تو بشرطِ زندگی اس نقصان کی تلافی کی جائے گی۔

اب ہم کو مرزا کی کلیاتِ نظم فارسی میں سے صرف مثنوی کاغزوہ دکھانا باقی رہ گیا ہے۔ اگرچہ پہلے حصے میں کہیں کہیں مختلف مثنویوں کے کچھ کچھ اشعار مقتضائے مقام کے موافق نقل ہو چکے ہیں مگر نمونے کے طور پر یہاں بھی ایک دو مقام کسی مثنوی کا دکھانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مرزا نے کوئی مبسوط مثنوی نہیں لکھی۔ ان کے کلیات میں گیارہ مثنویاں ہیں جن میں سب سے بڑی مثنوی ۹۲۸ بیت کی ہے۔ اس مثنوی میں جس کا نام مرزا نے ابرگہزار رکھا تھا، ان کا ارادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات بیان کرنے کا تھا مگر چونکہ یہ ان کی آخری تصنیف تھی اور اخیر عمر میں طرح طرح کے عوائق اور ذوالعیش آئے، اس وجہ سے غزوات کے شروع کرنے کی نوبت نہیں پہنچی۔ صرف دیباچے کے چند عنوان لکھنے پائے تھے کہ مکروہاتِ روزگار نے گھیر لیا۔ مگر یہ مثنوی ان کی تمام مثنویوں میں ممتاز ہے اور ہم اسی مثنوی کے کچھ اشعار توحید میں سے اور کچھ اشعار مناجات میں سے جو نہایت آزادانہ اور رندانہ طور پر لکھی ہے اور کچھ نعت میں سے اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

از توحید

سپا سے کز و نامہ نامی شود	سخن در گزارش گرامی شود
سپا سے کہ شور یرکان است	دہندش بہ بانگِ قلم دلِ نرست
سپا سے بہ بوزش در آہنختہ	ز دل حبستہ و بادل آویختہ
سپا سے دولی سوز کثرتِ رباع	سپا سے دل افروزِ ہمیش فراے

خدا سزد کز درون پروری
فدای که زان گونه روزی دهد

یدیں شیوہ بخشد شناساوری
کہ ہم روزی و ہم دوروزی دهد

رضا جوے ہر دل کہ درویش ہست
ز نجد زانبوہ خواہندگان
خرد و ہنس ہستی فروشندگان
باید دل آما ز دل دادگان
ز باوے کہ ہر دل دزد در ہفت
نگہ را کہ بیرون نہ باشد ز چشم
دل و دست با ہمہ گر دوختہ

ہوا خواہ ہر دل کہ گردش ہست
نیاید بستوہ از پناہندگان
دہد مژدہ بیہودہ کوشندگان
کشہ مارا لیکن ز انتادگان
زبان را بہ پیدا در کرد بگفت
دہد بل پیرانی مہر و خشم
دریں کیسہ کر ذار انداختہ

یعنی در کیسہ کہ از ہمہ دوختن دل و دست ہم رسیدہ کردار مردم اندوختہ است۔

روان و خرد با ہم آمیختہ
نہ زیں سو گہرا شمر دن توان
بہ بیرون نہ چرخ بر ہم زدن

ازیں پردہ گفتار انگیختہ
نہ راہ اندرین پردہ برین توان
نہ شاید نہ راست او دم زدن

یعنی بقوتی کہ از ان نہ چرخ را بر ہم نہ توان زد، از معرفت الہی دم نہ می توان زد۔

گروہی بہ بندہ گہر یافتن
یکے را دم تیشہ بر کان نخورد
خرد کز جہانے ست ہمیشہ خبر
نہ بیند جز این ایچ بیند
نگارندہ پیکر آب و گل
بگردش در آرنندہ نہ سپہر

فدایستہ دل در زمین یافتن
یکے رو بہ نایاب گوہر نہ برد
نہ باشد نہ عنوان خویشش خبر
کہ مارا بود آفرینندہ
شمارندہ گوہر مان دل
بگردوں بر آرنندہ ماہ و مہر

رواں را بدانت سرای ساز
 به شاهی نشاند خسرواں
 بدانش به اندیش فرزائنگاں
 جگر را ز خوابه آشام ده
 شناسندگان را بخود رهنمای
 نفسها به سودای او ناله خیز
 رگ ابر را اشک باری از دست
 زبانهای خاموش گویای او
 خرد را که جوید شناسائیش
 دولتی بے کفن مرده در رهش

ز بهستی محض و عین وجود
 ز شاقا به کز قلزمی سردهد
 بیک باد بهخشد زبیرا
 جهان ز طوفان بغرقاب در
 گرد به زستی به غوغا دروں
 اسیرش ز بندے که بر پای است
 شهیدش بخویش از طرب بهره مند

بهر لب که جوی، نوالے از دست
 اگر دیو ساریست بهیوش و تنگ

زبان را بگفتار پیرای ساز
 ز زمین در پانندہ رهرواں
 به مستی بنگهدار دیوانگاں
 نفس را به بیتابی آرام ده
 هر اسندگان را غم از دل بهای
 جگر را به صحرای او ریز ریز
 دم برق را به یقراری از دست
 نهان پای اندیشه پیدای او
 نگو خیره در برق پیدائیش
 خودی دادگر شمنه در گهش

که نازد به یکتائیش هست و بود
 به ترشد آشام دیگر دهد
 به رفتہ رقص جدا گانه
 هنوزش ہماں چین بگرداب در
 هنوزش ہماں بے بینا دروں
 شناسد کہ بر تخت ہیں جائے است
 بجز چشم زخمش نباشد گزند

بهر سر کہ بینی ہوائے از دست
 کہ ہموارہ پیکر تراشد ز سنگ

بہ بت سجدہ زان رُو روا داشتہ
وگر خیرہ چشمے ست نیز پرست
بمہر ش ازاں راہ جنبیہ مہر
نزاری درونانِ اہریمنی
ز بس دادنا آشنائی دہند
بہ تن ہا بر آذر گرایش کنان
گروہے سرا سیر در دشت و کوہ
زر سے کہ خود را براں بستاند
ز ہرے کہ نہ خواست در دل بود
نظر گاہ جمع پریشاں یکے ست
کہ امی کشش کاں ازاں سو کیمت
جہاں چسبت بہ آئینہ آگہی
بہر سو کہ رُو آدمی لٹوے اوست

کہ بت را خداوند پنداشتہ
بہ دُردے از جام اندیشہ ست
کزیں روندش دست بنودہ چہر
گروہے بود کز خرد دشمنی
بہ آتش نشانِ خدائی دہند
بدلہا خدا را نیایش کنان
خداوند جوے و خداوند گوے
بیز داں پرستی میاں بستاند
پرستند حق گر بہ باطل بود
پرستند انبوه ویز داں یکے ست
بدونیک را جز بُوے رُوے نیست
فضائے نظر گاہ وجہ الہی
خوفاں رو کہ آویدہ رُوے اوست

از مناجات

برونے کہ مردم شوند انجمن
رواں را بہ نیکی نوازندگان
گہر ہاے شہوار پیش آورند
ز نوریکہ ریزند و خرمن کنند
بہ ہنگامہ با این جگر گوشگان

شود تازہ پیوند جانہا بہ تن
بہ سرمایہ خویش نازندگان
فرو ہیدہ کردار پیش آورند
جہاں را بخود چشم روشن کنند
در آیند مشے جگر تو شگان

ز جہلت سر اند گریباں فرو
 ز غم ہاے ایام گنجینہ
 ز دشواری زیستن مژدہ
 دل از غم بہ پہلو دو نیم اندو
 دم اند کشاکش ز پیوند دم
 نگہ خورده آسیب دوش از نگاہ
 تہیست و در ماندہ ام' وائے من!
 نسجید بگزار کردار من
 گراں باری در دہ عمرم بسنج
 ندلم بغیر از نشان جلال
 مرا بایہ عمر رنج ست و درد
 غمے تازہ در ہر نمد از تو بود
 دم سرد من' ز مہر یرمن ست
 جہیمی دل' ز مہر یری نفس
 پر کاہ را صرصرے بڑہ گیر
 در آتش خس از باد انتادہ دلا

ز حسرت بدل بردہ دندان فرو
 دراں حلقہ من باشم و سینہ
 در آب و در آتش بسر بردہ
 تن از سایہ خود بہ بیم اندرون
 ز ناسازی و ناتوانی بہم
 ز بس تیر گہاے روز سیاہ
 بجختاے بر ناکسی ہاے من
 بدوش ترا زوا مذ بار من
 بگردار سخی میفرائے رنج
 کہ من با خود از ہر چہ سنج خیال
 اگر دیگران را بود گفت و کرد
 چہ پرسی چو آن رنج و درد از تو بود
 فرو ہل کہ حسرت خمیر من ست
 مبادا بہ گیتی چو من پیچ کس
 بہر شش را در ہم افسردہ گیر
 پس آنکہ بدو دنخ فرستادہ دلا

پہر شش سے مراد باز پرس قیامت ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے باز پرس سے مستثنیٰ رکھو اور یہ سمجھ لے کہ مجھ سے باز پرس ہو چکی اور ایک پرکاہ کو بادِ صرصر اڑائے گئی اور یہ فرض کر لے کہ میں دودنخ میں بھیجا جا چکا اور ہولے ایک تنکا

دیکھتی آگ میں گر چکا۔

وگرچہ چین ست فرجام کار کرمی باید از کردہ راندن شمد

یعنی اگر انجام کار یہی ہے کہ اعمال کی باز پرس ہونی ضرور ہے تو

مرا نیز یار اے گفتار وہ جو گویم براں گفتہ زہنا ردہ

دریں خستگی پوزش از من محوی بود بندہ خستہ گستاخ گوی

یعنی اس خستگی اور مصیبت کی حالت میں جو کچھ میری زبان سے نکل جائے اس پر مجھ سے خدمت چاہنا کیوں کہ خستہ و مصیبت زدہ غلام گستاخ گو اور بے باک ہوتا ہے۔

دل از غصہ خون شد نہفتن چہ سود چونا گفتہ دانی از گفتن چہ سود

زباں گرچہ من دارم اما ز تست بست ارچہ گفتارم اما ز تست

ہمانا تو دانی کہ کافہ نیم پرستار خورشید و آذر نیم

نکشم کسے را بہ اہریمنی خردم ز کس مایہ در رمزی

مگرے کہ آتش بگورم از دوست بہنگامہ پرواز مورم از دوست

یعنی صرف مجھ میں ایک عیب ہے کہ میں شراب پیتا ہوں اور اسی سے میری زندگی

ہے، اس مطلب کو اس طرح ادا کرنا کہ "آتش بگورم از دوست" اور "پرواز مورم

از دوست" منتہاے بلاغت ہے نشہ شراب سے جو عارضی نشاط اور امنگ پیدا

ہو جاتی ہے، اُس کو پرواز مور سے بہتر کسی استعارے میں ادا نہیں کیا جاسکتا۔

کیوں کہ جس طرح چیونٹی کی پرواز اس کی موت کی علامت ہے اسی طرح نشہ شراب

کا عارضی نشاط آخر کار مورث ہلاکت ہوتا ہے۔

چہنی کرم اے بندہ پروردگارے!

من اندوگمین وئے اندو ریلے

حسابے ورامش و رنگ دیوے
 کہ از بادہ تا چہرہ افروختند
 نہ از من کہ از تاب من گاہ گاہ
 نہ بہستان سرے نہ میخانہ
 نہ رقص پری پیکراں بر بساط
 بسار و زگاراں بہ دلدادگی
 بسار و زباران و شبہاے ماہ
 افق را پراز ابر بہمن مہی
 بہار ان ومن در غم برگ و ساز
 جہان از گل و لالہ پریوی و رنگ
 دم عیش جز رقص بسمل نہ بود
 اگر تا فتم رشتہ گوہر شکست
 چہ خواہی زد بقی مے آلودین
 بنا ساز نگاری نہ ہمسایگان
 سراز منت ناکساں زیر خاک
 بہ گیتی دزم بینوا داشتی
 نہ بخشندہ شایہ کہ بارم دہد
 کہ چوں پیل زانجا برانگیزے
 نہ نازک نکاصے کہ نازش کشم

ز جمشید و بہرام دیو و ز جوس
 دل دشمن و چشم بد سوختند
 بد یوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
 نہ دستاں سرے نہ جانانہ
 نہ غوغاے رامش گرہ بر بساط
 بسا نو بہاراں بہ بے باوگی
 کہ بودہ است بے مے بچشم سیاہ
 سفالینہ جام من از مے نہی
 در خانہ از بے نوائی فراز
 من و حجرہ و دامنی زیر سنگ
 بہ اندازہ خواہش دل نہ بود
 و گریانتم بارہ ساغر شکست
 بہیں جسم خمیازہ فرسود من
 بہ سرمایہ جوی زبے مائیکاں
 لب از خاک بوس خاں چاک چاک
 و لم را اسیر ہوا داشتی
 بہر بار ز پیل بارم دہد
 زرش بر گدایاں فروریزے
 بہر بوسہ زلف درازش کشم

بدیں عمرِ ناخوش کہ من داشتم
 چو دل زیں ہوسہا بجوش آید
 ہنوزم ہماں دل بجوش اندست
 چو آن نادراری بہ یاد آیدم
 دے را کہ کمتر شکید، باغ
 صبحی خورم گر شراب طلوع
 دم شب رویہاے مستان کو
 دہاں پاک میخارے بے فروش
 سیہ مستی ابرو باران کجا
 اگر حور در دل خیالش کہ چہ
 چہ منت نہد ناشناسانگار
 گریزد دم بوسہ، اینش کجا
 بزد حکم و نبود لبش تلخ گوے
 نظر بازی و ذوق دیدار کو
 نہ چشم آزد و منہ دلالہ
 ازینہا کہ پیوستہ میخواست دل
 چو پرکشش رگے را بکاود ز دل
 بہر جرم کز دے دسترسد
 بفراے کایں داوری چوں بود
 ہر آئینہ بچوں منے را بہ بند
 بدیں مویہ در روز امید و بیم

زجاں خار در پیرہن داشتم
 ز دل بانگِ خونم بجوش آیدے
 ز دل بانگِ خونم بجوش اندست
 بہ فردوس ہم دل نیا سایدم
 در آتش چہ سوزی لبسوزند داغ
 کجا زہر و صبح و جام بلور
 بہنگامہ غوغاے مستان کو
 چہ گنجائی شورش نلے و نوش
 خرم چوں نباشد بہاران کجا
 غم بجز ذوق وصالش کہ چہ
 چہ لذت دید و صلے بے انتظار
 فریبہ سوگند، دینش کجا
 دہر کام و نبود دلش کا مجوے
 بہ فردوس روزن بدیوار کو
 نہ دل تشدد ماہ پرکالہ
 ہنوزم ہماں حسرت آلاست دل
 دو صد دہلہ خونم تراود ز دل
 ز من حسرتے در برابر رسد
 کہ از جرم من حسرت افزوں بود
 تلافی فراخور بوداے گزند
 بگریم بد انسان کہ عرشِ عظیم

تو بخشی بیل گریه ام آہوے
 ز پاداشش قطع نظر کردہ
 سپید آب روی سپیدیم هست
 کج اندیشہ گبر مسلمان نما
 ہوادار فرزند و خوراک تست
 بہ غالب خط رستگاری فرست

شود از تو سیلاب را چارہ جوے
 و گر خون حسرت بندہ کردہ
 گزشتہم رحمت امیدیم هست
 کہ البتہ این رند تا پارسا
 پرستار فرخندہ منشور تست
 بہ بند امید استواری فرست

از نعت سید المرسلین

جزایش ندانت دانا کاوت
 کہ دروے نگنجد و نگب خوی
 ز ذات خدا معجزے سرزده
 بعے ایزد از خویش امیدوار
 دے، بچو بہتاب در چشمہ
 بہر کام از معجزے سربراہ
 ز دم جستہ پیشی نزد آمدن
 برنگے کہ ناویدہ پایش گزند
 بکاشش سوار رقم نارتا
 نظر قبلہ گاہ و جہاں دیدگان
 بگفتہ کافر مسلمان کنے

محمدؐ گز آئینہ روے دوست
 رہے روشن آئینہ ایزدی!
 ز راز نہاں پردہ برزده
 تمنائے دیرینہ کردگار
 تن از نور پالودہ سرچشمہ
 بہر جام الہ تشنہ جود خواہ
 کلاش بدل، مد فرو دامن
 خرامش لبیک از قدم نقش بند
 بہ دستش کشاد قلم نرسا
 دل امید جاگی زیاں دیدگان
 بر رفتار صرا گستاں کنے

بعقبی ز آتش رہائی دے
 بآمرزش امید گاہ ہمسہ
 بنزدیکی حق سرافسراز بود
 مدائیش بودے ز اول بگوش
 نظر گاہ پیشیں فرستاد گاہاں!
 روانی رہ نقد عالم بخویش
 گرامی کنے سجدہ سیماے او
 حقن بستہ چین کیسویے او
 جہلنے بیک خانہ آباد کن
 بہ اندیش خویش و دعا گوے خیر
 کہ سنگ پیش سنگ آہن ریاست

بدنیاز دیں روشنائی دے
 بخوے خوش، اندوہ کا وہمہ
 ز بس محرم پردہ راز بود
 ز رازے کہ باوے سروے سروش
 خجے قبلہ آدمی زاد گاہاں!
 کسائی و نسل آدم بخویش
 بلندی رہ کعبہ بالائے او
 یمن روشن از پر تورے او
 ز بیت بندگی، مردم آزاد کن
 بحراب مسجد رخ آئے دیر
 تو گوئی از بس دل دشمن ریاست

نثر فارسی

مرزا کی فارسی نثر کو جو مقدار میں فارسی نظم سے بہت زیادہ ہے، اس بنا پر کہ وہ وزن سے موافق ہے، صرف ایشیائی اصطلاح کے موافق نثر کہا جاسکتا ہے۔ اور نہ اگر وزن سے قطع نظر کی جائے، تو مرزا کی نثر میں شاعری کا عنصر نظم سے بھی غالب تر معلوم ہوتا ہے، خصوصاً کلیات نظم کا دیا چہ اور خاتمہ،

مہرِ میرونی کے ابتدائی عنوان، تمام تقریظیں اور دیباچے جو لوگوں کی کتابوں پر مرزا نے لکھے ہیں اور مکاتبات کا ایک معتد بہ حصہ سراسر شاعرانہ خیالات اور پوٹیکل نظم و نسق پر مبنی ہے۔

متاخرین میں ابوالفضل، ظہوری، طاہر و حیدر، جلال لائے طباطبائی، نثار مانے جاتے ہیں۔ مرزا بیدل کی نثر اگرچہ ان کی نظم کی طرح ایک دوسرا عالم رکھتی ہے، مگر وہ بھی اپنی شان اور اپنی آن بان میں بے نظیر ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے (اور ضرور تسلیم کرنی چاہیے) کہ مرزا نے متاخرین کی طرز انشا پر دازی سے استفادہ کیا ہے، تو بھی متاخرین کی نثروں میں مرزا کی طرز کا سراغ لگانا ایسا ہی ہے جیسا تھئی آم میں پیوندی آم کا مرزا ڈھونڈنا۔ تقریباً ساٹھ برس گزرے کہ لکھنؤ کے ایک نہایت لائق آدمی نے مرزا کی نثر کی نسبت یہ بات کہی تھی کہ شیخ ابوالفضل اور مرزا بیدل دونوں کے مختلف اسٹائلوں سے کچھ کچھ مختلف باتیں افذکر کے ایک عدا اسٹائل پیدا کیا گیا ہے، لیکن جب مرزا کی نثر کا ان دونوں کی نثروں سے مقابلہ کیا جاتا ہے، تو مرزا کی کوئی ادا ان کی طرز ادا سے میل نہیں کھاتی۔

اگرچہ مقتضائے مقام یہ تھا کہ مرزا کی نثر میں جو خصوصیتیں ہم کو معلوم ہوئی ہیں ان کو یہاں مفصل طور پر بیان کیا جاتا، اور ہر ایک خصوصیت مثالوں کے ذریعے سے ناظرین کے ذہن نشین کی جاتی، لیکن چون کہ لوگوں کو اس قسم کی ترقیقات سے کچھ دل بستگی نہیں ہے اس لیے ہم اس بحث سے قطع نظر کر کے حسب وعدہ ان اصحاب کی ضیافت طبع کے لیے جن کو فارسی زبان کے ساتھ باوجود اس کی کساد بازاری کے اب تک کچھ نہ کچھ لگاؤ چلا جاتا ہے، مرزا کی نثروں میں سے بطور نمونے کے کچھ کچھ التقاط کرتے ہیں اور ہم کو امید ہے کہ

یہ نمونہ اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے کافی و کافی ہوگا کہ مرزا نے نثر فارسی میں بھی اسی قدر بلند پایہ بہم پہنچایا تھا، جیسا کہ نظم فارسی میں ان کو حاصل تھا۔

اگرچہ مرزا کی نثر کو اگلے نامور انشا پردازوں کی نثر پر ترجیح دینا، تاوقتیکہ اس کو دلیل و برہان سے ثابت نہ کیا جائے، ایک ہی معنی بات ہے، لیکن ہم کو اُن لوگوں سے جو وجدانِ صبیح اور ذوقِ سلیم رکھتے ہیں، امید ہے کہ وہ مرزا کی نثر میں ایک عجیب طرح کی لذت اور شوخی اور ایک نئی طرح کا بانکپن دیکھیں گے، جس سے تمام متاخرین کی نثریں بالکل معزاً ہیں۔

چوں کہ مرزا کی طرائف پر بازی سے اکثر لوگ نا آشنا ہیں، اس لیے جہاں تک ممکن ہوگا ہم ان کی نثر میں سے ایسے مقامات اخذ کریں گے، جو صاف اور سلیس ہوں۔ اور با ایں ہمہ جہاں ضرورت ہوگی، کہیں بین السطور میں، کہیں بریکٹ میں اور کہیں فٹ نوٹ میں حل طلب مقامات کی شرح بھی کرتے جائیں گے۔

مرزا کے تمام فارسی کلام کی املا میں ایک خصوصیت ہے، جس سے اکثر لوگ ناواقف ہیں۔ یعنی وہ بعض الفاظ کو تمام اہل زبان اور زبان دانوں کے برخلاف دوسری صورت سے لکھتے ہیں۔ مثلاً صد کو سد، شخصت کو شست، غلطیت اور طپیدن کو غلتیدن اور تپیدن، گزشتن اور گزاشتن کو گزشتن اور گزاشتن، آذر اور تندرو کو آذر اور تندرو وغیرہ۔ چوں کہ یہ املا ناظرین کے تردد کا باعث تھی، اور نیز ہم اس املا کو صحیح نہیں سمجھتے، اس لیے اس کتاب میں جہاں کہیں مرزا کا کلام نقل کیا گیا ہے، وہاں الفاظِ تذکرہ قدیم معمولی طریقے کے موافق لکھے گئے ہیں۔

نثر فارسی کے نمونے

از مہر نیروز

خطاب زمین بوس

مہر نیروز کے دیباچے میں حمداور نعت اور مدح پادشاہ کے بعد ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ مرحوم کی طرٹ خطاب کر کے اپنا درد دل بیان کیا ہے اور اس خطاب کا نام خطاب زمین بوس رکھا ہے۔ اس کو کسی قدر صحت اور استقامت کے بعد ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں:

قاآن شیوہ خاقانا و خواقین خدائیکانہ! روشی آوردن من از عدم
بوجود بسوداے گہر سنجی و گہر فروشی بود، کالاے بیش بہاے من دریں چار سُو
روی روانی ندید و متاع گرانمایہ مرادیں بازار ایدش از نالی نہ شد۔ ناچہ ہر چہ باخوش
آوردہ ام چوں گویم کہ باخویش می برم ہنچے در سفینہ ہا و پارہ در سینہ ہا می گذارم و
می گذرم بس از من آن گنج شایگان را اگر ہمہ باد بر را گو بر و اگر ہمہ خاک بخورد و اگر
بخورد۔ سینہ آرزو ہاے جوان میرا مدفن ست، لعل انگاہ کرم چہ سراغ گوید
غریباں باد۔

نیائگان نامہ نگار از تخریفات اسباب دیشنگ بودہ اند، و فرماندہان با فرو
زبنگ۔ فرو مردن چراغ ہستی نور دیدہ تور بہ باد استین کینہ کیخسرو و شنگیان را
بہار

۷۔ مرزا کتبہ بک تقریباً ہمیشہ ان نقطوں کے بعد جن کے آخر میں واو یا الف ہوتا ہے بغیر اضافت کے بھی
تعلک طرز پر یا ہی زاید لاتے ہیں مثلاً تو یا شو یا یا اور جا کی جگہ رے، سوے، پائے لکھتے ہیں۔

روز سیاه پیش آورد۔ خداوندان اورنگ و پیم را از آن برگ و ساز با جز تیغ
گندناگون بکف بنامند۔ بمرز و بوم بیگان روی آوردند، و بدست مزد تیغ ندن
نان خوردند۔ ہم ازیں نیستان ایوانان کسار نشین، سلجوقیان دگر بارہ سر
بافسر و افسر بگوہر آراستند۔ چرخ گردند چنانکہ خوی دوست این نامداران
کاؤس کوس را نیز از پای انگند۔

در شرب با خواہش فرودس بخوبی در مجمع ما طایع مسعود نیابی
در بادہ اندیشہ ما در نہ بینی در آتش ہنگامہ ما در نہ نیابی
از واپسیان این قافلہ نیایے من کہ قلمرو ما و رالنہر سمرقند شہر، مستقط الراس
وے بود، چوں سیل کہ از بالا پستی آید، از سمرقند بہند آمد۔ در دفتر بہیدرنا
نشان ذوالفقار و لہ میرزا بخت خان توقیع نوکری شاہش نوشتند و بہر
پہاسو برات روزی وے و سپاہش نوشتند۔ پدرم پیشہ پدیر خویش
داشت، و ہم دکارزار جامہ گزاشت۔ ہمانا گلبن شکے ترا نوآمین نوا بلبل
ہی بایست کہ مرا زمزمہ سخن و دستاں سراے آفرینند۔

رباعی

غالب بکہر زدودہ زاد شمم زان زو بصفای دم تیغ ست دم
چوں رفت پہیدی، ز دم چگن شر شد تیر شکستہ، نیاکان قسقم
خاکم بسر کہ بغریب پندار آزادہ روی بسخن لا ابایانہ پرداختم، و اندازہ از دش
سخن و پایہ والائی مگوہر خویش نشاختم۔ سینہ من نفس راشت بروان آسانی
نیسے کہ از سترن زار و زدا بازیان زدہ۔ من کہ دم مجز بہ تابا بایست نہ زدم، و بنان
مراقبے بود بہ دجلہ باری ابرے کہ از قبلہ خیزد بہمدہ کوش۔ من کہ بایان بشود
زار فرورہ ختم۔

با ایں فروغ گوهر و خشای نہاد ذیں ساں سیاہ روزگار کرد روزگار
 با فرو فرہنگ برگانہ، و بانام و تنگ دشمن، با فرو مایگان ہمنشیں و با او باش
 ہم رنگ، پاسے ہر اہم پوسے و زبان بے صرف گوے، در شکست خویش گردوں
 را دستیار، و در آزار خویش دشمن را آموزگار، دل پر از خار خار، و دیدہ
 نشتر زار، نہ دستگاہ خود نمایانہ آرایشے، و نہ سرو برگ آزادانہ آسایشے۔
 سرگزشت ہر کس ہماں فرمان پاسے امضا پذیرفتہ، سر نوشت دوست؛ در آنچه
 بر من رفت، دوستان را با من چہ جای سر زلش، و مرا با دشمنان چہ
 گنجائی پر عاش۔

گنجایش لنگر گشت ضرر و کشتی شکست موج دانا خورد و بیخ کہ نادان چہ کار کرد
 پس از ہنگام سالہ آوارگی کہ تیزی رفتار من از مسجد و بیتخانہ گردانگشت، و خانقا
 و میکدہ را بیکگر زد، بغروب آں فرہ ایزدی کہ فریدوں را بہ قناب
 دادگری دل افزوخت، و مرا فرہنگ سخن گستری آموخت، بدان در فروم آورد
 کہ تو نیز جوں ملکہ، چشے بدان در داری، و نتوانی کہ دیدہ برداری....
 تا ہمسایہ اویم، سپہریاں در سایہ من اند و تا خاک نشین آں درم از شنگار
 در رشک پایہ من اند۔ در دل دیدہ روشناں جاے من ست و بر سر
 ماہ و ستارہ پاسے من۔ دریں گوشہ گزینی و خوشہ چینی تخت آید، رحمتے کہ
 بر من از بالا فرود آمد، رو دادن خجستگی زمیں بوس گہماں عذیو خدا دان بود
 دولت رو آورد، بخت از خواب جست، حور چشم روشنی گفت رضوان
 بر رضا جوئی آمد، چرخ از رفتہ عذر خواست، روزگار از گذشتہ بجلی طلبید۔

سہ اس دیے مہاں کالے صاحب کا دروازہ مراد ہے جو مہار شاہ کے پیر تھے اور مرزا ان کے مکان میں رہتے تھے۔

نومیدی از تو کفر و توراضی پیکر
نومیدیم دگر به تو امید دار کرد
کالبد خاکی مرا چون پیکر گرد باد جانے در میان نیست؛ ہمیں یک دود مرگشگی تماشا
دارد۔ مگر عندلیب گلشن تصویرم کہ ہوسے گل زمزمہ از دے نتواند مید، یا سبزہ جوہر
شمشیرم کہ بوزیدن بادستانہ نیارد۔ حمید۔ گشتگی پیوند نشاط کہن شد، و خون از
دل بہچنان در چکیدن ست، تا پیوند چہ قدر استوار بود؛ و چہ مایہ بزور گسستہ اند
شعبہ بادل دیوانہ کہ نختے از من ہوشمند تراست، گفتم کہ اگر گشتار نیہ رود ہی المشاہ
ارم کار گاہ بارگاہ عرضہ دارم کہ آئینہ رازم، مرا می توان زدود؛ و بندہ سخن طرازم، مرا
می توان پرورد گفت، اسے ناداں! ایس سخن از جاے دگر بود و ہنگام آں گذشت؛
اکنون اگر ہمیتوانی گفت بگوے کہ خستہ ام، مرہم می توان نہاد؛ و مردہ ام، جان می توان
بخشید۔

رباعی

شاما! ہر چند پایہ جوے آمدہ ام دانی کہ چہ مایہ نغز گوے آمدہ ام
آہم کہ محیط را بجوے آمدہ ام رنگم کہ بہار را بہ روے آمدہ ام
اگر چنانکہ بدوران توأم، ہر روز گاہ فرناہ جمشید بودے، جمشید روزگار را آفرین گفتے؛
و اگر بدانسان کہ ثنا خوان شہر یارم، فرخ فریدوں راستودے، فریدوں چرخ و
ستارہ را گرد سرگشتے۔ در اں انجمن کہ زردشت آتش افزودخت، و ژند آورد،
اگر من بدیں دم آذر فشاں جاداشتے، آذر از بیم من زیانہ نہ زدے۔ و از دلفریبی
بیان من کس بشنیدن ژند نہ برداختے۔ من بدیں فرخی بخت کہ چون تو خداوند کار فرما
دارم، ہر قدر بر خویش تن بنازم، جادار و سرت گردم؛ تو نیز بدیں گرمی ہنگامہ بناز
کہ ہجو غالب بندہ آتشین نواے داری۔ اگر بہ اندازہ ہنر و ادب التفات می لہی، جاے
مردک دیدہ بمن باز گزار؛ و در دل بروی من مکشای۔

گویند، در عہدِ جہانپانی حضرت ^{شیخ} صابقرانی ثانی بفرمانِ آن خسرو در یادِ کلیم
را صدہ بسیم و زر اعل و گہر ^{بسیج} سنجیدہ اند۔ من آن خواہم، دیدہ و ماں را دستوری دہی تا از
کشش و کوشش نہ رنجند، و یکبار گفتارِ مرا با کلامِ کلیم بسنجند۔

پریشاں نوابی من در ستایشِ گفتارِ خویش اگر خود گزان نباشد، گفتارِ راست
بگستاخی گزاردن ہم از انصاف نباشد۔ آخر نہ ہمانم کہ ہر وقت خود را بیج شمر دے،
در بیج گاہ بر خود گمانِ کمالے نبردے۔ سرستیِ ذوقِ برزیدین این والا نظر کہ برگزیدہ تست
مرا از من بُرد، و خامہ بے پروا پوسے را بدیں روش و آہنگ بخرامش و رامش آورد
..... ہمانا بلند نامی سلطانِ دہر در آفاق چشم داشت کہ چوں نے را کہ بجاد و بیانی
شہرہ آفاقم بگردار گزاری گماشت۔ من خود از آن رُود کہ دل و زبانِ این بیدار و خیز
آئینہ دارِ دل و زبانِ شاہ است، و انہم کہ آنچه عمدۃ الحکامادریں بابتِ من فرمودہ، ^{یعنی} فراموش
شاہ ست۔

بادشاہاں را شاگفتن نہ کار ہر کس ست دیدہ در شبے کہ کارِ گفتن اندازد بمن
نامہ نگارِ کردارِ را بہ تو مندی تو فیقِ سر انجام خدمت، سعادتِ یاد دانی، و عاقان
را بہ سایہ سوا دیاں نگارش کہ ظلماتِ آبِ حیواں ست، حیاتِ بیدار زانی باد۔
فخو یہ فقرے مزانے ہر نیروز میں جہاں سببِ تابعیتِ کتاب لکھا ہے اس کے
آخر میں یہ ظاہر کیا ہے کہ کسرِ نفسی کی معمولی رسم کے برخلاف اگر میں اپنی طرزِ بیان
کی داد لوگوں سے چاہوں، تو یہ کوئی بیجا بات نہ ہوگی، بلکہ علینِ تقیہ و تمیز کی بات
سمجھی جائے گی۔ اس کے بعد کہتے ہیں،

کالاشناسی را نہ آن آئین ست کہ نکوئی کالاسے خویش از نظر اندازند و پرکار

کشائی را نہ آں دستودست کہ بر سر پیکرے کہ خود کشد، عشق نہ باز نہ مگر بانی آن نقش
 را کہ خودی ز دمازا عجز نمی شمرد بمو آفتاب بت را کہ خودی ترا شبیہ نماز نمی برد؛ یزدان
 را بندہ سپاس گزار باشم، اگر قلم را بہر جنبش آفریں نگوییم، و از سخن بہر اندیشہ سپاس نہ
 پذیریم۔ رفتار کبک و تدرود دل از دست برد، و خرام این رعنا لعبت رقص سرست
 نکند؛ ماشا کہ خراش کلک بر ورق این مایہ ذوق انگیز تواند بود تیرست کہ بسند
 در حالت سرستی تصمیم خود نمایانہ بنازی خرام۔ این پارسی آمیختہ بتازی کہ از زبان
 چہرہ دستی عرب بر عجم در گیتی پدید آمد، خسروی گنجینہ در بستہ بود کہ غار من قفل
 درش را کلیہ آمد۔ پرویز کجاست تا بنگرد کہ دریں رہروی کدام رہ سپردہ ام، و ہر
 کجاست تا فرار رسد کہ سخن را از کجا بجا بردہ ام:

خسروی بادہ دریں دور اگرے خواہی پیش ما آے، تہ جرد از جلمست
 خود ستانی فرو ہم، و بندہ پندار یکسلم۔ آو خ، اناں روزگار کہ از خوی بنا سازی و
 از کار بازی سپری شد؛ و داد اناں بے دار کہ در روزش افزونی خشم و کام بردن
 دہوش رفت۔ از کار فرماے این نگارش سپاس پذیریم کہ پہواختن این نظم کہ خود را
 چہل سائہ با زمین ہموار ساختہ ام تا پیرداختہ ام، و با نگین این نقش کہ چشم و دال و
 نگاہ و نفس با ہم آمیختہ ام، تا آئینہ ام۔ درست از کار ہے دگر کوتاہ است و دل
 از اندیشہ ہے دگر بر کنار۔ نامہ نگار کہ از کردار گزاری بگفتن و دد دل ر دے آودہ
 بود، باز بہ پاسے سخن می آید و جاوہ کہ نشان دارہ اند می پیاید، نگارندگان ہمین چشم باشند،

۱۔ تصمیم و احتراق بخمین کی اصطلاح میں دو متقابل لفظ ہیں جب کسی ستارے کا فاصلہ مرکز افق سے ۶ درجہ ہو تو
 کہتے ہیں کہ یہ ستارہ احتراق میں ہے کجاء جب یہ فاصلہ ۱۶ دقیقہ یعنی نسبت احتراق کے ۳۴۴ دقیقہ کم ہو تو کہتے ہیں کہ
 تصمیم میں ہے۔ ان دونوں سندسے کا تصمیم میں ہونا اس کی عمدہ ترین حالت ہے

دشنوندگان سرا آگوش

طرز واقعہ نگاری مرزا نے ہر نیروز میں جس طریقے سے واقعات تحریر کیے ہیں، یہاں دو ایک مثالیں اس کی بھی لکھی جاتی ہیں۔

از رویداد قبل خان کہ از نیاگان امیر تیمور بود

خان خطا با خویشتن سنجید کہ با قہریان قوم مغل ہر روزد، ہر انجیز نامہ رواں داشت، و گزیدہ روشے را بہ نامہ بری و میا ^{بینی} گری گماشت۔ فرستادہ آمد و جہان پہلوان قبل خان را زمین بوسید، و نامہ سپرد و پیام گزارد۔ صرفہ در آشتی بود نہ در فرو گذاشت۔ پہلی بہادر را بجائے خود نشاند و بہ معنائی نامہ آورد تو بن تیز گام ^{نام برادر قبل} سوے خطارانند و فرماندہ آن کشور سران شکر را پذیرہ فرستاد و موہاں را بخوشتین ^{استقبال} نشین فرود آورد و پادشاہ سپہر بارگاہ بر یک خان شستہ و نان خوردند،

و راق آشا میدند مگر خرد پیشہ قبل خان را در اندیشہ گذشتہ باشد کہ مبادا خطایان ^{دلیانہ} زہر بہ بادہ آمیزند، و بدیں رنگ خون مہمان ریزند، در ہر بزم پس از اندک مایہ درنگ بہ بہانہ آب تاغین بروں آمدے، و بہ ستم شگوفہ ^{بہر محبت} گرفتے، و خوردہ آشامیدہ از دہن فرورستختے۔ چوں بہ بزم اندر آمدے، و گریارہ ساغر گرفتے، و خوردنی از سر گرفتے۔ خطایان بہ شگفت فرماندہ کہ یارب! ایں چہ نیرومند و زور آدر کسی ست کہ از ما بیشتر میخورد و خورش را بجئے گران نیست، وئے از ما فروں تر میکشد و ہشیار تر از ما ست۔ میکشاں دانند کہ چوں بادہ پر زور دمام خورد، ہر چند ہر بار شگونہ اندازند، نہ آنست کہ مستی مدوے ندہد، و تاب بے دیز بونی ^{بہر} قے منش را بہم برزند شے بارہ بر فرد زور آورد قبل خان ریش دارے خطا کہ اتان خان نام داشت گرفت و بسوے خود کشید و ناسزا گفت۔ میزبان خشم فرو خورد، و نزد بکان خود را کہ بہم برآمدہ بودند، از گستاخی باز داشت۔ با ملدان مہمان آہنگ باز گشت سرود ^{بہر}

میزبان که از بدستی و دشمنی سرگران بود، چنانکه میزبانان و امن میہاں زود
از دست ندہند، و آرزوے دیر ماندن کنند، نکرد۔ کلاہ ہلے گوہر آگین،
و کمر ہلے زریں، درخشندہ نگین ہلے بیش بہا و پرستہ ہلے پرنیاں و دیبا
پیش کشید، و پیرود کرد۔ ہنوز یہو رود نہ رفتہ بود کہ بداموزان اتان
خان را از جلب ہرند، و ہراں آوردند کہ قبل خان از راہ برگردانند، و بدرگاہ
آوردند، و کالبدش را بدشنہ و خنجر از ہم فروکشایند۔ سخن بہ نر می گزارند ستارہ
ان ہر فرود آرنده۔ بدیں کار کمر بست و قبل خان را براہ دریافت، بیاز آمدن
فریغت۔ رمیدہ رام نہ شد، و از راہ برگشت۔ فرستادہ تنہا باز آمد و بفرستندہ
خبر داد۔ بگروہے از گردان و بلان فرمان رفت کہ جلو گسیختہ شتابند و
ہر کجا یابند اگر بشادی و زادی نیاید، بخواری و زاری آورند۔ مگر قبل خان
را براہ دوستی بود از دودہ ستورہ سلحوق، بکا شاند، وے فرود آمدہ
وانم از بہر آسایش آہنگ دو سہ روز آبخورد داشتہ باشد، خطائیاں شوریدہ
مغز دریاں دہ رسیدند و خان را دریاں خانہ دیدند۔ سخن بدیاں لایم ساز کردند
کہ خاقان فریب خورد، و خواست کہ شوے خطا برگردد۔ خانہ خدا کہ خرد از
مہر فزوں داشت، ہفتہ باد پائے پیش کشید و گفت، کار ہا دیگرگون ستند
رفتن بخطا خود بہیچ رُوس روا نیست۔ تنہا بدیں گروہ میاویز، و بریں باد
توسن نام بر نشین، و سوے ایل و اولوس بگریز۔ ناگزیر ہچنان کرد، و
جان گرامی بہ تیز گامی مُرد۔ خطائیاں رُوسے باز گشتن نہ داشتند۔ پے امید گاہ

۱ یعنی کسیکہ بطع زبانی و مید سازی ستارہ را از ہر فرود آورد

۲ پے برداشتن نات نمودن امید گاہ بکے خویش یعنی کسی کہ در طلب او بجا پوی نمودند

تنگا پوے خویش برداشتند. خان پسر آستان نخست آرایش جارید و خطائین پس
 با قاجول بهادر و فرزنگاد شکر سگاش رفت که چه می باید کرد انجام کار به بهیدید
 یکدیگر بدخواهان را شدند، تا از تهمک کشتند چه دروند.

شهریار قبل خان از یک بانو ^{یعنی و یکجمله در کت کا انهم کیا بود} نکو دیدار که از قوم قنقرات بود، شش
 پسر داشت. نخستین و دومین به او گین یر قاق و قویله خان نام آورد و گری
 به نام های دیگر و شناس. روزی نخستین این دو برادر نام آور ناگاه به شکار
 گاه از بهراں جدا می ماند، و راه گم کرده هرزه می گردود. تا نا نا غایاں که
 غارتگری پیشه داشتند و پیرامن قلمرو مغول همواره راه می زدند، با این شهسوار
 پریشان رفتار بری خوردند، و چون می دانند که کیست با سیری می برند و باتان خان
 خطائی می سپرند. خان که دلی پنداشت، فرمان می دهد که شهزاده را بر خر چوبین
 به بیخ لای آهین بر دوزند و ^{یعنی بر آهین} ناز بکش از رواں بردارند و خداوند بخوان
 را که از پیش رنجور بود، بجگر تابی این داغ در دافزود. چون دانست که ناکام
 می باید مرد، دومین پسر خویش قویله خان را به جانشینی گزید. و بکشیدن
 انتقام خون برادر وصیت کرده، چشم از تماشای جهاں پوشید. قویله خان
 تا نگین سلیمان بخت آورد، بفرایم آمدن سپاه فرمان نشست. فرماں بران و
 کینه خواهاں از هر سو به تختگاه رُوس آوردند:

که چون لعل بودی سراپا جگر	شهنشاه دانا دل ریده ور
بسوی خطا ترکست از آورد	برای شه که لشکر فزاد آورد
به جنبش در آورد کوپه گرا	ز مردان و گردان و کنه آورد
منش با بخون رخسار تیز شد	از آن رو که بایست خونریز شد
ردم باد بر رُوس پرچم زدند	^{یعنی این وجهی که قویله خان بر آهین نهاد} دلبران ز دشمن گشتی دم زدند

ز تاتار تا گرد انگشتند به بنگاہ خانِ خطار بختند

اتان خان دل و دست و عنان و سنان بکار آورد و خود را با سپاہ
از ستارہ بشمار افزود تر، به پیکار آورد. کوشید و کوشیدن سود نداشت
رقم فیروزی بنام قویہ خان کشیدہ بودند۔ شکستِ ^{مست} شکستِ بر خطایان
افتاد، علم با واژگون شد، و اندیشہ بگریز رہنمویں۔ چنان بان اتان خان بگریختن
جاں بُرد، و تن ہلے خست و دلہاے شکستہ از میاں بُرد۔ بشہر اندر آمد
و در بُروے سپاہ کینہ خواہ بست۔ قویہ خان و لشکر یانشہ آنہاے بگ و
ساز بہ یغما بودند کہ در اندیشہ گنجد۔ سپاس گزار چرخ و اختر گشتند و گرایار
و سبک عنان برگشتند۔ پادشاہ بچشم روشنی پیروزی سپاہ رعیت را صلاے
عشرت اندوزی داد۔ ہنگامہ جشن گرمی پذیرفت و بزم سور آرایش یافت۔
خواہی ہنگامہ گرم کن و خواہی بزم آراے، مرگ را نہ آن فدنک یکمان ست
کہ خطا کند؛ قویہ خان را نیز ہنگام خویش ناوک بر نشان خود۔ چوں سپہ
نداشت بر تان بہادر جاے پدر از برادر گرفت۔ بسکہ دلیر و مردانہ بود، نامش از خانی
بہ بہادری و ذہان رفت۔ بروز کار جہان داری این شہر یار دلاور، برقِ اجل، خرم
ہستی تا جولی بہادر سوخت، دلپیش اردچی بر لاس لبیر شکری رُخ افروخت۔
پارہ از احوال امیر تیمور

روزے میانہ امیر قزغن و امیر طراغائے دربارہ اولوس و قشون
سخن می رفت و فرزادہ فیروزی فرامیر تیمور دلاور با پدر ہمزبان بود۔ پدر را
از گفتار باز داشتہ خود بشکری سخن سراسے شد، و بدان ہنجار نہ علم چند بر تار

ستم بجان کج اندیش می توان کرد غفل ز راستی خویش می توان کرد
 روزگاری دراز تر از رشته طول امل، بالوک طوائف در کجدار و مرز و ستیز و
 آویز گذشت. همگان چشم براه و گوش بر آواز داشتند تا نایل اسبقند یار نیرو را
 از کدام سو چشم زخم رسد. و پشه امیر حسین که جز بر لود و غریو درنگ و نیرنگ
 کاری نمی کرد، و در انبازی و دمسازی، فتد پردازی و شعبده بازی شبیه داشت.
 نیرنگ سازی اقبال عدو مال صاحبقران کشورستان را نازم که هم آن گرد و بے شکوه
 بسو پاسبان بنگ خورده، و هم این گزده و دستبرد را با بجا دست از کار نداشت
 صده اتفاق افتاده است که این نفاق پیشگان خرد دشمن خویش گرفته را از نزد
 پختاغان دست گرفته بر تکیه گاه خسانی و مرزبانی فشانده اند، و زود در شمشیر بر سر
 مانده اند. تنها به سلیکنا را مسند و نطع از پے هم مہیا بود، و سراپا سرور را با
 نازی باش و خشت گور از پس یکدیگر آماده:

سیر ستاره و روش چرخ نیلگون	اینها کند هر آینه در مذہب حکیم
آمان آن کم که پسندم طریق و ہم	زاختر چو شکوه چوں ز بود جز غدایم
نمود بجز ظہور صفات و شیون حق	صلح و دروغ و شکست و امید و بیم
تو قیام معنویت کمال صاف و دسم	تشریف خسر نیست گراطلس اگر کلیم
از حق بود اضافه هستی بہر صفت	جز وای نبود آنچه بہ سائل دہد کریم

همچنین بارها امیر حسین را از در ماندگی و زبونی کار سخت افتاده است و سلطان سام
 هم آورد، و افساس پست و آبرو بگری و بے بخشوزہ بیاری و یاوری دل نہادہ است.
 کینہاے نہائی امیر حسین آشکارا بود. ہمہ می دانستند و قدیو ہمہ داں از ہمہ فزوں تر
 می دانست. دامن کہ در ضمیر حق پدید آرد ہم ناگزیر می زشت باشد کہ مکر این سست مہر

خواه زشت و کردارهای نکو میدیگنارد و جهاندار را در بناراستی و جانیاں را پس
 به دراز دستی نیازارد۔ آن نا جوانمرد را فریاد یزدی کجا که بچشم و کام نگردد، و راه دانش
 وادرد در آردین دل آرم نداشت و در بردن زرشکیب، و در کشتن خلق پرواه
 تو پار ساطبی عاشق و من آن رنم که نفعی بکلیه او باش اشکار کشد
 پایان کار لشکر پاش از ناخوشی ستوه آمده، آن جوان میرا خدا گیر را با هر چهار پسرش
 گرفته آوردند، بخداوندگار سپردند۔ دارای تبر و آرمه را آهنگ عاجز گشتی نبود
 و خون گرمی پاداش (یعنی جوش انتقام) نداشت۔ می خواست بر نا بخشودن بخشودن
 و گناهان نا بخشیدنی بخشیدن، از نهاد اهل رزم خروش برخواست۔ خاصه شاه محمد مزبان
 بدخشان، و شیخ محمد بیاں، سلدوز، و امیر کج خسرو که ریشهای نو و ناسورهای کهن
 داشتند۔ زخمه تیز تر زدن و نبواهای خوشچکان خونا به فشاں فغاں بر آوردند که با قصاب
 خون آسای ریخته می خواهم، نه انتقام نقتلهای انگیزه که والی ولایت آن را بکل تواند کرد
 ناگزیر بدین گفتار فرجام گیر و دار بشرع حواله رفت۔ کار آگاهان و دانش پانان
 خون ریختن فرمودند و سادات و علما به کشتن فتوی دادند۔

پنداری چون خون گرفته اینها شنیده باشد در دل اندیشیده باشد که خود را بگریختن
 از سنگاه بدر برد۔ و سپس در زاویه گمنامی که همسایه نیستی است موفدگار بسر برد۔
 از آنجا که سلاح و سلب نداشت، سرا سیمه از جارت، و از خرگاه بدر آمده بجنگ
 سیلی و مشت ره گریز پیش گرفت۔ خون خواهان بخون گرمی آید و آویختند
 و خوش را که بدین گرم شده بود، گرو گرم بر زمین ریختند۔
 تو ای نیم که مانی ز تازه روی خویش بسزه که سر از طرب جویبار کشد

فریب مهر ز گردوں مخور که این بے مهر دهد فشار کسی را که در کنار کشد
 ہوا سے تاج شہی ہر کر ابود در سر سرے بھد فن شاہان تا جدار کشد
 پارہ از احوال ہمایوں و شیر شاہ

شیر خان رادل دگر بود و زبان دگر، بے لایہ گری و فسون گستری پیام آشتی
 در میان داشت، تا چنان شد کہ هیچ کس راستیزہ در اندیشہ نگذشتے ازاں گیل و
 لاکہ کہ در راہ پیودہ بودند، در روز و شب از دہروی نے نے از شنادری نیاسود
 نمودند، پیادہ آزرده پاے بود، و سوار فرسودہ اندام، و ستور پشت ریش فریب
 دوستی از دشمن خوردگان (یعنی ہمایوں و لشکر یانش کہ فریب از شیر شاہ خوردہ بودند)
 دست از فارت و تاراج غنیم کشیدند، و دم آسایش غنیمت شمرند۔ پایہا بہ باد زہ
 دامن آتش شد (یعنی پا بدامن کشیدہ بخواب رفتند) و پیکر پاچوں صورت دیبا
 پیوند پذیرفت۔ سراز باش بر نمی خیزد تا کلاہ و مغفرا چہ کنند، و پیراہن حریر بر
 ست تا چلقند و جوشن کجاہرند۔ ہوا نمناک بود، و ابر رشح فشاں، تیغ در نیام زنگ
 بست، و نمزیں بر بارگی گراں گشت۔ سپیدہ دے کہ تیرگی تار میخ جہل را فرو گرفت
 بود ہنگامہ سازان ہنگام جوے یکسرہ بر غنودگان رختند۔ شگرت سرا یکی پدید آمد
 طرفہ ہزاہر در لشکر افتاد۔ کلاہ از کمرہ و پارہ ۴ از افشار نشناختند۔ از رخت خواب
 جستہ و براس پان بے زین نشستہ، پرانکہ ہر طرت تاختند۔ گروے "ہر چہ
 بار بار" گویاں سوارہ خود را بیدیا زدند و ہر دے چند ساحل جویاں بہ شنا
 دست و پا زدند تا کہ امان بزخم دم تیغ و کہ امل بہ خیم موج رود مژدہ باشند و

۱۔ یعنی از شنادری گیل دلاے ۲۔ کنارہ دامن ۳۔ پل ۴۔ یعنی لشکر شیر شاہ

کہاں از طوفانِ این دو آب (یعنی آبِ تیغ و آبِ رود) جاں بسلامت بڑوہ باشند
 شہنشاہِ بحرِ بردہایوں، نہنگِ دشتِ نورد دریا شگان (یعنی اسپ) را از فرازِ ساحل
 در آب انگزد۔ پسے از رکاب، و عنان از دست، و اسپ از خمِ ران بید رفت۔
 و شاہ سوارے کہ شاہن ہنگامِ سواری بوسہ بر رکابش می زدند، غوطہ در آب خورد۔
 نظام نام آزارہ از آب کشان لشکر کہ پنہاں از خویش اقبال را چشم براہ و گوش بر صدا
 داشت (یعنی بے آنکہ خبر داشتہ باشد) منتظرِ عروج و اقبالِ خود بود، و با خویشتن
 دریں اندیشہ کہ از ساحل چوں گزرد، بر ساحل جا داشت، ہوا خواہانہ بدان چستی،
 کہ گوی گوے دولت بڑوہ، خود را بآب دزد۔ بارے بدانست آشکارا بیناں سقائے
 سخت کوشے بود، و بہ والادید معنی آشنایان فرخ سروشے بود کہ چہانباں را از
 گرداب بد آورد و بر جہانیاں منت نہاد۔

از دستنبوہ

اگرچہ مرزا کی نثر میں عموماً عربی الفاظ بہت کم آتے ہیں، لیکن کتاب دستنبوہ
 میں جو قصہ کے حالات پر مرزا نے لکھی ہے، التزام کیا گیا ہے کہ تمام کتاب میں کوئی عربی
 لفظ نہ آنے پائے۔ باوجود اس سخت التزام کے مرزا نے دستنبوہ میں اپنی طرزِ خاص
 اور شاعرانہ ادا اور بانگین کو کہیں ہاتھ نہیں جانے دیا۔ چنانچہ نمونے کے طور پر دستنبوہ
 کے چند فقرے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں:

غدر کے اسباب

دریں روز گار کہ ہر دمزمہ را ہنجار و ہر ہمہ را رفتار، و ہر کجا سپاہے بود
 از سپہدار، سخن بیوندی بگذار و مگوسے کہ خود روز و روزگار، برگشت۔ اختر شناسان
 سپہرِ بیاس (یعنی منجماں) برآند کہ دراں روز گار کہ بزمِ نازیزد جرد شہر بارِ پارس
 از ترکستان تا زبان (اہل عرب) بہم خورد۔ کیواں (زحل) و بہرام (مرئخ) در خرچنگ

(برج سرطان) انجمن آراء و هنر آزماے بودند۔ اینک ہاں پایہ (درجہ) سیزدہم از
خرچنگ ہچناں بہم پرستن گاہ (جلے قرآن) بہرام کیوان ست و این شودش و پرغاش
و جنگ و خواری و خوشخواری، و رنگ و نیرنگ نمای (ظہور) آنست۔

و انا بدیں گفتار کے گرودے آں تا قتن لشکرے دیگر بود از کشورے دیگر،
و این برگشتن لشکرست از خداوندان لشکر، چناں کہ از دستان باستان پارسایان پاک
بہم نہانستن (عدم مشابہت) این دوستیز و آویز ہویدائی دارد۔ در اں بار کہ
سخن و کیش بود، ایران ویران بہ فتر و فرہنگ کیش نو (یعنی اسلام) فرجام آبادی
و از بند آزربندی (آتش پرستی) آزادی یافت۔ در ایں بار کہ گفتار در آیین ست
ہندیاں بہ چشمداشت کلام آیین تازہ شادماں باشند؟ پارسایاں رخ از آتش تافتند،
و بسوے خداراہ یافتند۔ ہندیاں دامن دادگراں (یعنی اہل فرنگ) از دست دادند،
و بشکنجہ دام ہمدی دواں (درندگان) افتادند نہی مینی کہ از دامن تادام و لا داد تا
و د چہ مایہ دوری ست، و ازانست کہ آرامش (راحت) مجذ در آیین انگریز چشمداشتن
کوری ست۔ زخم تازیانہ تازیان از خوبی آں کیش فرخ (اسلام) مرہمے داشت،
روزگار در نور دایں خستگی (یعنی غم) خجستگی اگر میداشت، باراندہ از دوش لہلہ
نشد (پریشان و تباہ) برمی داشت۔ اگر در اندیشہ رازداناں بہ ہر دانش و داد
ازیں پس پیش آمدے (بہبودی) ہست، بہن نشان دہند، و بریل بلندگمین
بیناک سپاس نہند۔ جہانیاں با جہانباں ستیزند و لشکریاں خون لشکر آریاں
ریزند، و انگاہ شادی درزند، و بر خویشتن نہ لرزند۔ ہاں، اے
دانشگانِ فرز بود (حکمت الہی) و شناسندگانِ زیان و سود ایں ہنگام
بہ آتش خشم خداوند گرم است و رنہ کارزار پارس اینچنین امید سوز و آرزو
گزارند بود۔

کیفیت شورش باغیان در دہلی

پاشتگاہ دوشنبہ شانزدہم ماہ روزہ ویازدہم مئی سال یکہزار و ہشت صد و پنجاہ و ہفت تا گرفت در دلیوار بارہ و بارے دہلی بکبید و آن جنبش زمیں را فرا گرفت۔ سخن در زمیں لرز (زلزلہ) نمی رود، و در آن روز جہاں سوزا بخت برگشتہ و سرکشہ چند از سپاہ کینہ خواہ میرٹ بشہر آمدند۔ ہمہ بے آزر و شور انگیز، و بخداوند بخش تشنہ خون انگریز۔ دید بانان دروازہ ہائے شہر کہ بردن (علاوہ) از ہنگوہری و ہم پیشگی نشگفت (عجب نیست) کہ از پیش ہم سوگند نیر باشند، ہم پاس نہک و ہم پاس سبب شہر گزاشتند و بہمانان ناخواندہ یا خواندہ را محرمی داشتند۔ آن سواران سرگران سبک جلو (سبک عنان) و پیادگان تندخوے تیز و چول در ہا باز و دہ بان را مہمان نواز یافتند، دلیوار وار ہر سو شتافتند، و ہر کرا از فرماندہاں و ہر کجا آراشگاہ اک دہان یافتند تا زار نگشتند و پاک نہ سوختند، و بے ازاں شہر برشتافتند۔ مشتے گدایان گوشہ گیر از بخشش انگریزی تو شہ گیر کہ نان باثر و دفع می خورد و در شہر دور از یکدگر پراگندہ جا بجار و ز کار بسری برزند (یعنی رعایاے شہر) ہمہ تیر از تیر نا شناسندگان و از غوغاے زرد تیرہ شب ہراسندگان نہ ہلاکے در دست، و نہ فتنگے در شست، اگر راست پرسی، ایں مردم بہر آبادی کوے بزدن اند، نہ برائے آنکہ بہ آہنگ پیکار دامن بہ کمر زنند، یا اینہمہ ازاں رو کہ ماہ آب تیز رو بہ فاشاک نتوان بست، دست از چارہ کوتاہ دید، ہر یکے در سراے خویش بہا تم نشست یکے ازاں ماتم زدگان منم کہ در خانہ خویش بودم، چوں غریو و غوغا شنودم، نما از پر و بیش دم زدم۔ ہاں مایہ رنگ کہ مژہ بر ہم زدم، آوازہ بخوں غلطید صاحب اجنت بہادر و قلعہ دار درارک (قلعہ) و دویدن سواراں و پیایے رسیدن پیادگان در راستہ بازار از ہر گوشہ و کنار، بخت گشت ہیچ مشتے خاکے نہاند کہ از خون گل انداں

ارغواں ناز نشد، و پیچ کنج باغی نمود کہ از بے برگی مانا بد خمر نو بہار نشد۔ ہاے !
 آن جہانداران داد آموز، دانش اندوز، نکو خوسے، نکو نام، و آہ، ازاں خاتونان
 پر سی چہرہ نازک اندام، بارنے چوں ماہ دستے چوں سیم خام، و دروغ، آن
 کھوکھان جہان نادیدہ کہ در شگفتہ روئی بد لالہ و گل می خندیند و در خوش خرامی
 بر کباب و تذرد آہوی گرفتند کہ ہمہ یکبار بگرداب خوں فرورفتند۔ اگر مرگ برہالین
 این کشتگان بمویہ (بگریہ) خرد شد و دریں سوگ سیاہ پوشد، رواست، و اگر سپہر خاک
 گردد و فروریزد، و زمین سراسیمہ چوں گرد از جا برخیزد، بجاست :

ہاے نو بہار ! چوں تن بسط بخوں بخلط ہاے روز گلا چوں شب بے ماہ تار شو
 ہاے آفتاب ! روے بسیلی کہود کن ہاے ماہتاب ! داغ دل روزگار شو
 ہاے چوں آن روز تیر و بشام رسید و گیتی تاریکتر گردید، سیہ در و ناں خیرہ کش
 (بخیرگی کشندہ) ہم در شہر جا بجارخت تن آسانی انداختند، و ہم در ارک باغ
 خسروی را آخر اسپاں و نشین شاہی را خوابگا و خویش ساختند۔ رفتہ رفتہ از
 شہر ہاے دور دست آگہی رسید کہ شوریدگان ہر سپاہ، در ہر فرود آمدن گام منزل
 خون سپہداں رنختہ اند۔ گروہا گروہ مردم را از سپاہی و کشا و رز دل یکے گشت،
 و ہمہ بے آنکہ با ہم سخن رود، دور و نزدیک یک دست بر یک کار کمر بستند،
 و انگاہ چساں پُر زور کمرے و چگونہ استوار بستنی کہ جز بہ جنبش جوش خوں نے کہ از
 کمر گزند، کشادہ پذیرد۔ پندہ ی ایں لشکر ہاے بے مرد جنگجویان بے شمار را
 جاروب دار کمر بند یکی ست۔ آہے رُخت و رُوب ہند بوم بیاں ساں کہ آراش
 و آسایش اگر جویند باندازد، پر کاہے کاہے نیابند، ہمیں جاروب گیتی آشوب
 ہمیں خواست۔ اینک ہزار لشکر نگری، ہمہ بے لشکر آہے آراستہ، و بسا سپاہ بینی
 یکسر بے سپہاں بجنگ برخاست۔ توپ و کلور و ساچمہ (چھرا) و بارود ہمہ از خانہ

انگریز آوردہ، و با گنجیدہ داراں دوسے بتیز آوردہ، آئین نہرو و ہندش پکار ہر
 از انگریز آموختہ و نسخہ بکین امور مملکت افزوختہ۔ دلست، سنگ و آہن نیست
 چنانہ سوزد؟ چشمست، رخند و روزن نیست ہچوں نگرید؟ آرسا ہم بدایغ و رگ
 فرمانہاں باید سوخت، و ہم بر زیرانی ہندوستان باید گریست۔ شہر ہائے بے شہر
 پڑ بندہ ہائے بے خلدند، چنانکہ با فہائے بے باغبان پڑ از درختان نابرومند
 رہزن از گرو دار۔ آزلو و بازارگان از تمنا، غانہا ویرانہا و کلبہا (دو کلبہا)
 خوان یغنا۔

از دیباچہ ثانی درفش کاویانی

غالب خاکسدا ہرزہ کار را از آسمان بہ زمین فرستادند و فرمان دادند کہ دریں میث
 پیشہ کشاوندی (کاشتکاری) وند۔ وایں فرازاں (فراں) را بازماں (توقن)
 نہ پسند۔ ناگزیری بایست (ضرورتھا) کہ بستن و زمین خستن، آگاد راندن و دلا
 نشاندن۔ نادان (کشاوری نکرد بلکہ) بہوس در زمین غول جاں کند و ازاں
 گہرا کہ با خویش آوردہ بود نیمہ دریں زمین پراگند۔ ہمانا (گویا) از ہر دایکہ کاشت
 ہزار دانہ چشم داشت از مروارید کہ وہ خاک نہاں کنند۔ شنیہ کہ ریشہ سر برزند کاش
 جو کاشتے، تا شود برداشتے، دانست کہ ہر را خاک خورد یعنی تلف شد، تا چار
 نیمہ دیگر را پیش شاہن روکار بزد۔ دیدند و پسندیدند و خریدند شے با یکے
 از راز دانان پردہش (پرسش) رفت کہ در مبداء فیاض بخل نیست، ابر بر باغ
 و راغ و دمن و دمن یکساں باردا، چرامست کہ مردم چندے نادر و اندے (چندے)
 تو نکراند۔ گفت راست گفتی، توقع سر نوشت ہائیکے ست (یعنی یکسانست) اجل شاہ
 (ماہ الامتیاز) اگر هست، جز ایں نیست کہ کارہ بارگاہ از ہر یک بر یک ورق ووزو

سازِ جرگہ (گروہ) ، از ہر کس بر یک صفحہ نوشتہ اند۔ آئین ورق از دفتر با خویش
آوردند و براتِ روزی از ہر رد کہ مقدار بود بردند۔ ایناں ازاں رو کہ انفکاک
صفحہ از ورق صورت نہ بست ، تہیدست آمدند ، و تہی کیسہ زیستند کہ ہم از چیت
کہ اور چار سوے دہر ، ع

بختِ صلہ مدح و قبولِ غزل نیست

گفت ، آں از نیست کہ برات (چٹھی یا چک) نیاوردہ و این از انست کہ سخنہاے
بلنداری ، و پناشنا سا زباں (یعنی اجنبی زبان) حرف می زنی گفتیم ، چہ کہ ہم ، تا از
اندوہ باز رہم ؟ گفت شکیب دزد و خون گری ، و آنچه از شیخ علی حزیں شنیدہ ،
می گوے ۔

کس زبانِ را نمی فہمد بہ عزیزاں چہ التماس کنم
نشان دادنِ اغلاطِ برہانِ قاطع سپاس میخواست ، نہ ستیزہ و قلمرو ہند کس نماندہ
باشد کہ مرادیں نیکی بدخواندہ باشد۔ یکے خبر آورد کہ من قاطع قاطع برہانم ، دیگرے
اخگر آورد کہ من محرقِ آنم۔ کیست ، تا از من بدیاں جو ائمرداں گوید کہ از دیدنِ دشمن
کاغذ جز فغان و دُخان چہ خیزد ؟ بڑہ مند گناہگار منم ، اگر در آتش نکلند ،
و رب تیغِ دو نیم زند ، بہر دو گزند در خورستم (یعنی لائق ہستم) ، و بہر دو سزا سزا دار۔۔۔
سخندانِ راستی جوے را بایستہ آنکہ از ہر کتاب فرہنگ عبارتِ جامع آں را
بدیاں نگاہ تیز نگرد کہ از بس تیزی در جو ہر لفظ فرود تا چگونگی پیوندِ الفاظ
کہ انگیزش گاہ معنی ست ، آشکار شود۔ ہر گاہ آں را بہنجار اہل زبان نہ بیند ، اند کہ
در سوادے زبانہائی جز زیاں نمی بیند۔

دگراں داند و کار آناں؛ مرا نیز خردے و روانے داده اند۔ فراز آوردہ
(میش آوردہ) اندیشہ بیگانگان را چوں پذیریم؛ و از نیروے خرد خدا داد کار چا نگیرم؟
ہستی بخش را سپاس کہ نیرو فزاید دانش من دانشمند کسی ست کہ اگر چنانکہ
رازدان بود، رازگوے نیز بودے، ششیم ساسان بشمار آمدے:

ز خوشاں بہ بیگانگی شاد مانم	نمانم بکس چوں بکس مے نمانم
غریبم دے روشناس عزیزاں	چنار سرافراز در بوسستانم
گر فتم کہ از تخم افراسیابم	گر فتم کہ از نسل سلجوقیابم
دل و دست تیغ آزمائی ندانم	رہ در ہم کشور کثافتی ندانم
بمیدان معنی خداوند خشم	بمضمار پہلو زباں پہلوانم
دو سی سال توقیع معنی نوشتم	سزگر نویسند صا حقیقہ انم

قاطع برہان کہ صنعت نقشبند خیال من ست، نہ نامہ اعمال من ست کہ در آں جہاں
بمن خواہند سپرد ہم دریں جہاں خواہد ماند۔ در دل فرود آمد کہ بمقامے چند کلامے
چند بغیر ایم و این مجموعہ را کہ قاطع برہان نام نہادہ ام، سپس درفش کاویانی خطاب دہم:
نازم بہ خرام کلک و طرز درفش
چون اکہم کتب قاطع برہاں بود
ماناست ز تیزی بدم تیغ دمش
گر دید درفش کاویانی غلمش

۱ مراد از ان مولانا عبد الصمد استاد میزانت۔

۲ ساسان نام پسر بہمن بن اسفندیار بود کہ از پادشاہی بساحت و تحصیل حکمت و ریاضت پرداختہ و سرکس
اذ اولاً وکے نیز بطریق وکے بوزہ اند۔ این ہر تہارہ را ساسان اول و دوم و سوم و چہارم نامیدہ اند۔ بہمن بعد
پس از خسرو پرویز، ساسان خیم بفلور آمدہ کہ دساتیر از لغت ژندہ در زبان درسی ترجمہ کردہ۔

حاشاکہ درایچ محل از عقیدہ خویش رجوع کردہ باشم۔ سرودن سخنہاے ریزہ (متفرقہ)
جزافزدون ہوش انگیزہ (سبب و باعث) نذر دہ یاراں جفا کنند و من بہ از اے ہرجا
(بعض ہرجا) و فادرزم۔ ہمانا نکوئی و بہی یاراں خواہم و بس۔ بند نہند، پند دہم۔ وار
دریغ دارند، اندرز دریغ ندارم۔ سنگ زشد، ثمر بارم۔

از تقریظات و دیباچہ ہاے

مرزا نے جو تقریظیں اور دیباچے اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابوں پر شریں
لکھے ہیں، ان میں، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، شاعری کا عنصر نظم سے بمراتب غالب تر
پایا جاتا ہے۔ ہر ایک معمولی بات کو تمثیل اور استعارے کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں
فردوں اور ان کے اجزاء میں ایک خاص قسم کا وزن اور تول اور اکثر سجع کی رعایت ملحوظ
رکھتے ہیں۔ اکثر جگہ صفات متوالیہ و متتابعہ ایراد کرتے ہیں اور صفات مرکبہ جو نظم کے ساتھ
خصوصیت رکھتی ہیں، اکثر استعمال کرتے ہیں پس سوا اس کے کہ یہ نثریں شعر کے اوزان
مخصوص سے جن کو اس کی ماہیت میں کچھ دخل نہیں، سوزا ہیں، ہر ایک اعتبار سے ان پر
شعر کی پوری پوری تعریف صادق آتی ہے۔

چوں کہ یہ نثریں مرزا نے خاص کر اپنے عالی دماغ اور نکتہ بیخ معاصرین کی ضیانت
طبع کے لیے لکھی ہیں، اور ان میں اپنی نوآمین طرازی اور تادرو سخی کا جیسا کہ چاہیے،
حق ادا کیا ہے۔ اس لیے جب تک کہ ان کے ایک ایک فقرے کی شرح نہ کی جائے،
عام ناظرین ان سے کچھ اطف نہیں اٹھا سکتے، اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ کتاب کا
حجم زیادہ بڑھ جائے گا، جس کی وجہ سے کتاب کا مطالعہ ناظرین پر شاق گزرے گا۔ لہذا
ان نثروں میں سے صرف اس قدر انتخاب کیا جائے گا، جس سے مرزا کی ان جزیل و گرانمایہ
نثروں کا کسی قدر اندازہ ہو سکے۔

اس غرض کے لیے ہم اول بطور مثال کے مختلف مقامات سے مختلف مضامین کے کچھ فقرے لکھ کر دکھاتے ہیں کہ مرزا کس طرح معمولی باتوں کو تمثیل اور استعارے کا لباس پہنا کر بلند منظر پر جلوہ گر کرتے ہیں۔ مثلاً کتاب ”ہنج آہنگ“ کا دوسرا آہنگ جو مرزا نے اپنے نسبتی بھائی علی بخش خان کی خاطر سے لکھا ہے اور جس میں اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف زبان فارسی کے متعلق کچھ ابتدائی قواعد اور ہدایتیں قلمبند کی ہیں، اس کے اول میں ایک تمہید لکھی ہے جس میں طرح طرح سے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس پھیکے اور سیٹھے مضمون پر کچھ لکھنا میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے۔

وہاں ایک جگہ مضمون مذکور کی نسبت لکھتے ہیں: ”زمین شور کہ چوں ذوقِ مے در طینتِ زاہد، هیچ گلبن را در آنجا ریشہ در خاک نہ دود، و خاک کے نام استوار کہ ہر دیوار کہ در راں ریگستان بر کشد، پیش از سایہ خود بجاک افتد۔“

فارسی دیوان کے دیباچے میں ایک جگہ اس مطلب کو کہ دیوان مذکور اور اس کے نوادر افکار میں آورد اور تصنع یا کسی استاد کی بلا واسطہ تعلیم اور ہدایت کو مطلق دخل نہیں ہے، اس طرح ادا کرتے ہیں: ”بنا میزد (یعنی چشم بردود) تختیں نقابے رست از روے شاہد ہر مہفت کرد، معنی بجنہش نسیم برافتاد، یعنی تنگ کشاکش دست ناکشیدہ، باز پس چہ اغیرت از گرمی چہ اغان نیم سوختہ پہلو رخ با فرد وختن زادہ یعنی داغ منتِ طس ناویدہ۔“

ایک جگہ اس مطلب کو کہ خدا تعالیٰ نے مجھے جیسا دماغ معنی خیز دیا تھا، ویسا ہی معنی کی قدر و قیمت پہچاننے اور اس کی بیان کرنے کا ملکہ بھی عنایت کیا، اس طرح بیان کرتے ہیں: ”سخن آفرین خداے عجمی آراے راستایم کہ تا نہا نخانہ ضمیرم را از فراوانی رنگانگ معنی بعل و گہرا نپاشت، باز ویم را تر از دوسے مرغان سنجی و خامہ ام را ہنگام گہرا پاشی از دانی دشت۔“

اب ہم کچھ کچھ عبارتیں دیا چوں اور تقریظوں سے انتخاب کر کے ہدیہ ناظرین
بآتمکین کرتے ہیں !

از دیباچہ دیوان فارسی

دیوان فارسی کے دیباچے میں ایک جگہ اس مطلب کو کہ لوگ مجھے اکتسابی علوم
سے بے بہرہ سمجھ کر میرے حسن بیان پر تعجب اور میرے کمال سے انکار کرتے ہیں،
اس طرح بیان کرتے ہیں :

”لاے خم میخانہ سردی نسبت ناچشد گان سگانند کہ بیچدانے را ایں مایہ
سیرابی نطق از کجا است، غافل کہ نم رشخہ یک فیض است کہ سبزہ را دمیدن، و نہال
را سرکشیدن، و میوہ را رسیدن، و لب را زمزمہ آفریدن آموخت و بہر تو بہتہ
از لی ہدایت شبگیر نکر دگان اندیشند کہ تیرہ سرانجامے را ایں ہمہ روشنائی گفتار
چراست، بخبر کہ فرہ تابش یک نور است کہ شمع را بشعلہ و قدح را بہ بارہ و گما
برنگ و دروں را بسخن برافروخت.....“

واعلم از کوتہ نظر ان تنگ چشم کہ دمیدن تازہ گل از گیاه، و درخشیدن برق بشہاے
سیاہ شگفت ندارند، و جنبیدن زبانہاے گویا بہ سخن ہاے نغز و شخوار انگارند۔
غنیہ مشکبیں نفس است و باد غایبہ سائے، و گل کشارہ ردے و بلبل نواسج، زبان
چگناہ کردہ است کہ سخن سرائے نباشد۔ مہر جلوہ بزابد و ذرہ بتابی و بحر روانی و قطرہ
آشتلم، دل را کہ گفتہ است کہ از شورش ستودہ آید۔ ہانا بہ دانستہ ایں گروہ بارہ در
خندانہ تو فبق ہماں قد بود کہ حریفان گزشتہ را تر دماغ ساختہ، مایا بساط بزم سخن
برچیدہ، و جام و سبو بر سر ہم شکستہ، و ازاں قلم قلم رادق نے برجائے ماندہ۔
پندارند۔ کاش، با نچنے کہ من در فرودیں زدہ یعنی صفت بالیں) بکلفہ ادبائش قدح
می گیرم فرارند تا وارند کہے فراوان ست و ساقی بیدریغ بخش، پیمانہ ہا جرعه

ریزست و لبها العطش گوے۔ و لشہ و ز من قال؛

ہو زناں ابر رحمت در نشان ست
مے و میخانہ با تہر و نشان ست
آہے، صہیائے سخن بہ روزگار من از کہنگی تند و پُر زور ست، و شب اندیشہ را بہ فر
و میدان سپیدہ سحری برات فراوانی نور ست۔ ہر آئینہ رنگان سرخوش غنودہ اند، و من
خوابستم؛ پیشینیاں چراغاں بودہ اند، و من آفتابستم۔

اس کے بعد ایک جگہ اپنے تمام فخر و مباہات پر افسوس کر کے اس طرح لکھتے ہیں،
الضاف بالائے طاعت ست، و رہولے کہ بل بالخوانی (یعنی خود ستائی)
زدہ ام، و در اولے کہ خود را شکر فی ستودہ ام، نیمہ ازاں شاہد بازی ست یعنی
ہوا پرستی، و نیمہ دیگر توانگر ستائی یعنی بار خوانی۔ بیداد میں کہ ہر جا بشاہ خمے از
زلف مرفولہ مویاں کشودہ شود، بلا در من آویزد، تادل بہ پیچاک آں شکن بندے؛
و خواری نگر کہ ہر گاہ از خود غافل و از خدا فارغے بر اورنگ سروری کج نشیند، ہوس
مرا برا نگیزد، تا بہ پیش بندہ وار راست استے۔ شادم از آزادی کہ بسا سخن بہ ہنجا عیش
بازاں گزار دستم، و داغم از آزمندی کہ ورے چند بگردید تا طلباں در مدح اہل جاہ
سماہ کردستم۔ درینا کہ عمر یک سیر نخستے بچار و چنگ مرآمد، و پارہ بہ دروغ و دریغ رفت
فرجام گراں خوابی بر سخاست، و آشوب ہوساکی فرو نہشت۔
از خاتمہ دیوان فارسی

خاتمہ دیوان فارسی میں اس بات کا غذ کہ دیوان کی تکمیل میں کیوں اس قدر
دیر لگی کہ اکتالیس برس کی عمر میں اس کے چھپوانے کی نوبت پہنچی، اس طرح کرتے
ہیں کہ فکر نہایت خود سراور بلکہ پرواز تھی؛ اس کی روک تھام میں بہت سادقت گذر
گیا۔ اور اس مطلب کو اپنے طرز خاص میں یوں ادا کرتے ہیں؛

ان وہان رخسے ہاں توسنی کہ عنانش مویے و مشاش بویے بر تافتے

و از شموی (سرکشی) گام بدرازی تنهاده جز به پنهان نشانی. از ترسند دلی عنانش
 کشیده، و به لایه آواز بوسه اش آرمیده داشته. چون پاره از راه بدیں گونه که بر شرم
 بریده شد، و روز بلند گشت، هم جوش تندی توسن فرو نشست، و هم دست و پاے
 سوار از عنان و رکاب خستگ پذیر آمد. تاب مهر نمروز، مغز در سوار گذاخت، و تکیه ریگ
 بیابان، نعل و پاے تگاور نرم کرد. رالیض رادم و کره را قدم بگذازد هم آں به آخر
 گزاشید، و هم ایں را بستر نیاز آمد. توانائی به چاره سگالی توسنی سر آمد، و در هنگام
 گسته دی خستگی روے آورد. کیست، تا از من پرسد؟ و اگر ناپرسید
 گویم، در ریش فرو دآید که دریں سی سال همت را با فطرت چه آویزشها (یعنی جنگها)
 روے داده؛ و پس از آنکه کار بدانجا رسیده که همدگر از کوفتگی فرو مانده، بمیانجی گرمی
 توفیق بکدام قرار داد آشتی اتفاق افتاده، خانه دیر جنبش بود و شوق زود گراے
 (جلد باز)؛ گفتارها از نهیب دور باش اندیشه بدر از نلے فاصل دل و زبان خون شد
 و اگر ناگه از دل به زبان رسید؛ و الا بسیجی همت آن را بخامه نه سپرد. هر چند منش (طبیعت)
 که یزدانی سر و شست، در سر آغاز نیز گزیده گوے و پسندیده جوے بود، اما پیشتر از
 فراخ روی (یعنی بسبب آزاد روی) پیله جاده نشناساں برداشته، و کثری رفتار
 آناں را بغزشش متنازه انگاشته. تا همدراں تگاپو پیش خراباں را نجستگی اندیش
 همقدی (یعنی بیات همراهی خویش) که در من یافتند، مهر بجنبید، و دل از آذر م
 (مروت) بدر دآمد. اندو و آوارگیهاے من خوردند، و آموزگارانه در من گریستند
 شیخ علی حزیں بجنده زیر لبی بیراهه روی پاے مراد نظام جلوه گرساخت و زهرنگاه
 طالب آملی و برق چشم عرفی شیرازی ماده آں هززه جنبش پاے نار و در پاے روپکا
 من بسوخت. ظهوری بسر گرمی گیرالی نفس (تا شیر کلام) حزیں به بازوے و توشه
 بکمر بست، و نظیری لا ابالی خرام بهنجار خاصه خودم بچالش (رفتار) آورد.

از دیباچہ دیوان تفتہ

دیوان تفتہ کے دیباچے کی تمہید میں ضعف و انحطاط قوی اور اپنے قلب بہت
کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

ہاں اے غالب تیرے روز و رزم اختراک بدیں ہستی و کسالی (شخصیت کے تراکبات)
بداں مانی کہ دانی، در عالم فرض محال سپندے دیدہ ایم، بر آتش آرمیدہ، اللہ اللہ ہے
مایہ جوش سوداست (یعنی غلبہ مادہ سودا) کہ ہر نفسے کہ می کشی، چوں خطے کہ از نقطہ
بر آوردند، ہمزنگ سویداست۔ آن قلمرو اندیشہ کہ از روانی خامہ و روانی گفتار آب و ہوا
داشت، دے تہش را زور دین پرستار بود، و چاشتگش را نسیم سحری پریشکار۔
بدیں ناخوشی و نژندی ویریں چراست۔ سبزہ را چہ افتاد کہ بہ چمدن دل از دست
تاشائیاں نبرد، و غنچہ را چہ روے داد کہ بہ دمیدن پردہ شکپ نظر گیاں زرد و

آن اثر پردہ سازت چہ شد زمزمہ خارہ گدازت چہ شد

آن ز جنوں پردہ کشائیت کو ولولہ سلسلہ غائبیت کو

آن نفس نالکندت کجاست وائے نگہ جلوہ پسندت کجاست

گفتی (یعنی در جواب گفتہ) کہ سوز غم وود از دل بر آورد، و گداز نفس آذر و زبان

زرد۔ بادے کہ ہر آئینہ نگداشت و بازبانے کہ ہمانا نسوخت، عند غمزدگی مسموع

نہست۔ بیاتما ہیں دل بذر ہرہ الحذر نولے را بہ سخن نہیم، وہیں زبان کشائیں

المقرسلے را بہ گفتار آریم (یعنی طوعاً و کرہاً تقریظ دیوان تفتہ بر نگاریم)

زمن جوے دد بد نکوز لیستن بگر خوردن و تازہ روز لیستن

سمن چیدن و در رہ انداختن دل افشردن و در چہ انداختن

(مراد از سمن چیدن و در رہ انداختن آنکہ بر سگناں اظہار خوشحالی می کنم و اندوہ

دردی را کہ دل افشردن عبارت از اں ست در چاہ می اندازم، تا بر بیچ کس ظاہر شود)

رواں کردن از چشم ہموارہ خون
 بہ شورا پشستن ز رخسارہ خون
 شگفتن ز دافے کہ بردل ر بود
 نہفتن شرارے کہ در دل ر بود
 از تقریظ تذکرہ گلشن بہار

ستایش سخن چشم بد دور، خمدہ سخن را شرابے ست پرنور کہ زمین ازاں بہلا
 (یعنی بددی،) دپہر ازاں بہ بوی آ پنخاں بہ رقص آید کہ اگر کعبہ را حجر الاسود
 از دیوار و مشتری را عامہ از فرق فرود آفتہ، شگفت نہماید۔

انتخاب از مکاتبات

مرزا کی نثر کا سب سے بڑا حصہ ان کے مکاتبات و مراسلات ہیں جن میں
 سے اکثر بہت صاف اور سلیس ہیں۔ اسی لیے ہم اس حصے میں سے نسبت
 اور نثر کے کسی قدر زیادہ انتخاب کریں گے اور جہاں تک ہو سکے گا
 مشکل فقرہ اور دقیق عبارتوں کے نقل کرنے سے احتراز کیا جائے گا،
 اور نیز جو امور مرزا کے خانگی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں، ان کو بھی
 چھوڑ دیا جائے گا۔

مرزا علی بخش خان فیروز پور جھر کے میں ہیں، نواب احمد بخش خان کا
 انتقال ہو گیا ہے اور ان کی جگہ شمس الدین خان مسند نشین ہوئے ہیں۔ مرزا
 نے علی بخش خان کو کلکتے پہنچ کر خط لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

میر فضل مولیٰ خان نام یارے داشتہ، اور انا گرفت (ناگاہ) در عرض
 راہ بہ مرشد آباد یافتہ۔ در نور گفتگو ہے و پرس و جو ہے کہ رفت، از جامہ
 گذاشتن (یعنی اندردن)، فخر الدولہ بہانہ بہن خبر داد، و باز بہ کلکتہ مرزا
 افضل بیگ و دیگران برگفتہ۔ آو خ! کہ چراغ روشن این دودمان مرد،

و شہستان آرزو ہاتھ دتا رہا۔ از جانب شما اندیشناکم و دانم کہ آنچه شمارا پیش آید
و نخواہ باشد۔ ناکساں را روز بازار خواهد بود، و فردایگان را گرمی ہنگامہ۔ زودا کہ
انجمن از ہم پاشد؛ و پراگندہ چند گرد آیند۔ دولت روے گرداند؛ و آسودگی برخیزد۔
زہارا ہوشمندی را کار باید بست، و ہوارہ بخود نگران باید بود۔

ایک اور خط کو جو علی بخش خان کے نام لکھا ہے اس طرح شروع کرتے ہیں،
جان برادر! سخن را از فراوانی بر روی ہم افتادن ست، و گرہ در گرہ گردیدن۔
و من آن میخواہم کہ اندک گویم، و سود بسیار دہد، و شنونده آن را زود در یاد۔
و این پیش (قصد) روانی پذیر نیست مگر آنکہ گویندہ در آن کوشد کہ نبشتن
از گفتن آن مایہ دور تر نہ رود کہ برای ہر دو رشتہ با ہمہم گرتوان یافت، و نقش
یکے در آئینہ دیگرے نتوان یافت۔ زمانے گوش بمن دارید و فرارسید کہ چہ میگویم
و اریں گفتن چہ میخواہم، و شمارا در برابر آن چہ می باید کرد و اندازہ آن بایست
تا کجاست؟ اس کے بعد کچھ خانگی معاملات تحریر کیے ہیں۔

میراعظم علی اکبر آبادی مدرس مدرسہ اکبر آباد جو میرزا کے ہموطن ہیں،
اور انھوں نے بیس برس کے بعد میرزا کو خط لکھا ہے اور خط نہ پہنچنے کی شکایت
کی ہے، ان کے خط کا جواب اس طرح لکھتے ہیں:

امروز شدارہ بد غم زدہ اند نشر برگ صبر و فراغم زدہ اند

از کثرت شور عطر مغرم ریش ست تا عطر چہ فتنہ برد ما غم زدہ اند

جنبش خامہ عیسوی ہنگامہ مطاع مکرم مخدوم اعظم را ناظم کہ با حیا ہے

ہوس ہاے مردہ ساحت خاطر را عرصہ محشر ساخت و بازار رنجیز گرم کرد۔

غار غار دیریں آرزو ہا سراز دل بد آورد۔ بیاد آمد کہ مرا ہم در گیتی وطنے، و از

مہربانان انجمنی بودہ است۔ چوں نشر پریش بمغز اندیشہ فرو بردہ اند (یعنی

احوال پر سیدہ اند، خونچکانی نوا ہاتھ شاکر دل بست۔ درازیِ زمانِ فراق کہ بگمان
مخدوم شانزدہ سال است و بدانت نامہ نگار کم از بست سال نیست، سرتیز کز لکے
بودہ است کہ نقشِ آسایش از صفو، خاطر بیاں سزودہ اند۔ آغاز و رود بدہلی
کہ در و بادہ غفلت بہ قدر داشتہم (یعنی بقیہ ہوا و ہوس در سر بود)، لختے از
عمر بہ پیودنِ جادہ کارانی ہوس گذشت، و بے راہہ خوابیدہ شد، تا سرازستی
بگردید (یعنی بدستی سے بھر گیا)، داندراں بخودی پائے مصطفیٰ پیا بہ گوے فروفت
دگر صے میں از گیا یعنی ایک ایسا صدمہ پہنچا کہ نشے ہرن ہو گئے (لاجرم درہم
شکتہ سرا پائے دگر اندوہ سرور و رے، برخاستہ۔ ہنگامہ دیوانگی برادر
یک طرف، و غوغائے وام خواہاں یک سو، آشوبے پدید آمد کہ نفس را لب،
ونگاہ روزنہ چشم، فراموش کرد، و گیتی بدیں روشنی روشنای در نظر تیرہ
و تار شد۔ بالے از سخن دوخت، و چشمے از خویش فرو بست، جہان جہان
شکستگی و عالم عالم خستگی، با خود گرفتہم، و از بیدار روزگار نالاں، و سینہ
بر دم تیغ مالاں، بکلمتہ رسیدم۔ فرماندہاں سر بزرگی و کوچکدلی (یعنی مہربانی
و شفقت) کردند، و دل را نیر و بخشیدند۔ آن ہمہ بختایش کہ مشاہدہ رفت،
امید کشایش آورد، و ذوقِ آوارگی و ہوائے بیاباں مرگی کہ مرا از دہلی بدر
آوردہ بود، بدل نہاند۔ و ہوسِ آشکدہ ہائے یزد و میخانہ ہائے شیراز کہ
دل را بسوے خود میکشید، و مرا بہ پارس میخواند، از ضمیر بد جست
(یعنی بمشاہدہ شہر کلکتہ جملہ ہوسہا از خاطر بدر رفت)۔ دو سال در آں بقعہ
مجاور بودم۔ چوں گور ز جنل آہنگ ہندوستان کرد، پیشاپیش دویدم،
و بہ دہلی رسیدم۔ روزگار برگشت، و کار ساختہ شدہ، صورتِ تباہی گرفت۔
اکنوں سٹشمن سال ست کہ خانماں بباد دادہ، و دل بر مرگ ناگاہ نہادہ،

کچنے نشستہ ام، و در آمیزش بروی بیگانه و آشنایان۔
 ”من اگر با اینہم رنج و اندوہ کہ پارہ ازاں باز گفتم، در نگارش نامہ
 و سپارش پیام کابل تمام و کوتاہ دم باشم، و بندگان وطن را بیاد نیارم، در عالم
 انصاف بزمند نیستم۔ اما اگر انما یگانہ جہان ہر و وفا کہ از دور افتادگان نپرسند
 و از مرگ و میاتِ دوستان باز بجویند، اگر گفتگو بمیان آید، و سمند شکوہ عنان
 بر عنان (یعنی بمقابلہ یکدیگر) تاز و گوے دعویٰ چگونه خواهند برد، و قطع نظر
 از حریف آب دندان (یعنی حریف مغلوب) کہ نمم، فذلے توانا را چہ جواب
 خواهند داد:

کس از اہل وطن غمخوار من نیست مراد دہر پنداری، وطن نیست
 مولوی نور الحسن نامی ایک نوجوان نے کلکتے سے مرزا کو خط لکھا ہے
 اور اس کے ساتھ ایک ٹرکا مسودہ اصلاح کے لیے بھیجا ہے۔ اس کے جواب
 میں جو خط مرزا نے لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں:

پدید آمد کہ خاطر عاظرا بجانب نثر گرایشے، و ہنگامہ ایں گفتار (یعنی نثر نگاری)
 را در آنجا (در کلکتہ) آرایشے ہست۔ بارے ہم دل بہ پسندیدہ شغلے نہادہ اید، و ہم
 اندیس فن گزیدہ روشے پیش گرفتہ اید۔ دم سردی شما (یعنی کم شوقی شما)
 بدانش آموزی آنچه دیروز (یعنی در زمانہ گذشتہ) بہ کلکتہ دیدہ ام، یاد میکنم۔
 و خون گرمی شما (یعنی سرگرمی شما) در خرد اندوزی آنچه امروز می نگرم، خود را
 بدیں شادی کنم۔ ہمانا در اندیشہ نہالے برگذر دارم، بذاں زودی کہ شمر
 از شاخ افتد، نخلے شدہ، و رطب بار آوردہ۔ نے نے، بہ ہنگامہ یوسفی در نظر
 دارم، بذاں خوبی کہ دل از فرشتہ رباید، از بند حجاب بد آمدہ، و ہر ہفت
 کردہ خواستہ آید کہ مسوزہ نثر در ہر ماہ بمن فرستید، و من آن را نگرے و نشست

ہر کرشمہ و انگیز ہر بندہ را بایستگی آراستہ بشما فرستم۔ صاحبِ من! مگر ندانستہ
آید کہ گفتار جز بگفتار سر نہ گردد، و سخن جز بہ سخن شناختہ نشود۔ ہر چند ارادت
شما ذریعہ سعادتِ من و خُرسندیِ شما موجبِ رضا مندیِ من است، لیکن تحریر
در میاں ننگید، و بہ میاںجی گرمی غارِ کار بر نیاید۔ آری نگارش یک دست است
و گفتار سخت سخت۔ ستردن یک لفظ از میانہ و آوردن لفظ دیگر بجائے آن بر نشاء
و انانہ شناسد کہ چہ مایہ گفتگو و چہ قدر پُرس و جو دارد۔ و حقِ این پُرسش
تو اں گزارد، مگر بہمزبانی۔ دریں نزدیکی یکے از برادران کہ در برادران ازو
عزیز ترے نیست، سخنہائے پراگندہ مرا کہ عبارت از نشرست، گرد آورده
و صورتِ سفید رادہ است۔ زیں پس اں مجموعہ پریشانی را پیشِ شامی فرستم
تا دست مایہ سگانش در سخن و باز نمایندہ اندازہ نکوئیِ من تواند بود۔

نواب مصطفیٰ خان مرحوم نے (جب کہ مرزا سے نیا نیا تعارف ہوا ہے)
مرزا کو خط لکھا ہے اور اس میں ان کی شاعری اور نکتہ سنجی کی بہت تعریف
کی ہے؛ اپنے نتائجِ افکار میں سے کچھ ان کو بھیجا ہے اور ان سے تازہ غزلوں
کی جو حال میں لکھی ہوں، درخواست کی ہے۔ مرزا نے اس کے جواب میں
جو ایک طولانی خط لکھا ہے، اس میں ایک لمبی تمہید کے بعد لکھتے ہیں:

”تا دکانم در کشادہ بود، و رنگ رنگ متابع سخن بروے ہم نہادہ، کس
از مشتریاں حلقہ بر در نزد، و سوداے خریداری از پیچِ دل سر بر نہ زد۔ چوں
دکان را کالا، و زبان را حرفہائے مگر آلا (یعنی آلودہ بخونِ جگر) نماند، روزگار
گراںمایہ خریدارے (یعنی نواب مصطفیٰ خان) پدید آورد کہ نقدِ رائجِ سخن خود را
بہ بہائے گفتارِ ناسرہ من می دہد و گوہر را بہ پادِ بیجانگی خرف می نہد۔
ہاں وہاں، اے خریدارِ دکانِ بے رولق! از فراوانیِ سترتِ درویدِ مسعودِ

ہمایوں نامہ چہ گویم کہ مرا، یا آنکہ نکوئی خواہ خویشم، بر من بہ رشک آورد۔
 حوصلہ مرا کہ فرسودہ غمہاے دہرم، گنجائی این مایہ شادی کو؟ و اندیشہ مرا
 کہ دل شکستہ دور باش یا رانم، فرجام پذیرائی این ہمہ قبول گجا؟ روزگار را
 از آزار خویش چگونہ پشیمان گیرے کہ اینچنین شادی را بخود در پذیرے، و
 دوستان ماتا کجا قدر ناشناس پندارے کہ از شما این قدر ستایش در بارہ خویش
 باور دارے۔ حقا کہ نہ آسان ست ستودہ شدن بہ زبان شیوہ بیاناں (یعنی
 فصحا، و دشوارتر از آنست اندازہ نمائی باندازہ دانان)۔

”قبلہ مزد چہل سالہ مگر کاوی آنست کہ فراہم آوردم، و بر فرقہ فرقتاں
 سائے افشاندیم (یعنی مجموعہ نظم فارسی)۔ اکنون آہم ہواں روانی و آتشم ہواں
 گرمی نیست۔ گویا پس از سختن آن گنج گنجداں رفته، و از سخن ہرچہ ازل
 آورد من بود، گفتہ شد۔“

نواب مصطفیٰ خان مرحوم نے تذکرہ گلشن بہار کا مسودہ مرزا کے مطالعے
 کے لیے بھیجا ہے۔ اس کو دیکھ کر مرزا صاحب نے نواب صاحب کی یہ خط لکھا ہے :
 ”من کہ زبانم در ستایش بقرار است و اندیشہ در سگائش (شورہ) گستاخ،
 امید کہ در اں پایہ یزیدہ خوشام گو یاں شمرہ نہ شوم۔ و بدیں مایہ جرأت بزہ مند
 نگردم۔ بنا میزد (چشم بد دور)، تذکرہ ترتیب یافتہ و مجموعہ فراہم آمدہ
 کہ پیش طاق بلند نامی رانقش و نگار است و نہاں نکو سرا بخانی را برگ و بار
 رہرو نظر چوں بہ بیدارے کنار تا پیداے ذوق سخن گاہ تماشا بردارہ،
 توشہ بہ اذین بہ مکر نتواند بست۔ خضر باں ہمہ مگر تشنگی کہ سکندر داشت،
 لبش بر شہ آہے تر نتوانست کرد و آن آب از دریا بخشیدن بود۔
 شاگرد ہے ! از دور و نزدیک بہ سخن زندگانی جاوید بخشیدہ، و این

لختے از عمر بکار دیگران کردن ست - جاوداں زندہ باشید کہ سخن گویاں
 از شما زندہ جاوید شدند - و ہنگناں را بہ نکوئی نام برآمد - بارے گہرہٴ مسقن
 خامہ و گوہریں نہ گشتن نامہ در رویہٴ الفت بہ نگارش اشعار پرویں
 نثار حضرت آزرده از چہ دوست ؟ ہر چند ذکر خدام بر عیسیٰ مقام
 در جریدہٴ ایں فن نہ سزاوار شان فضیلت باشد، لیکن اگر بمقتضای
 فرط محبت جراتے بکار می رفت، گناہے نہ بود و در تلافی آں بہ پوشش
 نیاز نمی افتاد۔

ملکیم احسن اللہ خان مرحوم نے مرزا سے جب کہ وہ کلکتے میں مقیم ہیں،
 خواہش کی ہے کہ اگر آپ نے اپنی کچھ نثریں جمع کی ہوں تو بھیج دیجیے۔
 اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں:

”درد مند نواز! نسیم ورود مشکیں رقم نامہ غنچہ ایں راز را پردہ کشاے
 و شمیم ایں نوید را غایہ سائے آمد کہ روزگار بہ کزکب مد طول زمان فراق
 نقش بے اعتباری ہائے من از صفحہٴ خاطر احباب نہ سترده، و ترکنا ز صرصر
 بیدار جدائی خاکساری ہائے مرا زیاد عزیزاں نبرده است۔

”در معرض طلب نثر فروماندہ ترازاں میزبان بے دستگاہم کہ ناگزرت
 (اچانک) مہمانے عزیزش از راہ دور در رسد، و بیچارہ بسا بگرد سراپاے
 سرمایہٴ خویشتن بگرد۔ تا شور باے رود پختہ و نان کشکینے (یعنی نان
 جویں) فراز آرد۔ من و ایمان مین کہ بگرد آور دین نثر پراگندہ نہ رواختہ

۱ اول سود میں مفتی صدیق الدین خان مرحوم متخلص بہ آزرده کا تذکرہ نہیں کیا گیا تھا مگر مرزا نے
 جب یہ خط لکھا، تو نواب صاحب نے ان کا تذکرہ بھی کر دیا۔

و خود را دریں کشاکش نینداخته ام۔ چه پیدا است کہ فرو ریختہ، کلکِ ایں
 کس (یعنی من)، نقشے ست نرژند (یعنی زشت)، یار قمی ست فرہمند (یعنی خوب)۔
 در صورتِ اول چه لازم ست، خود را بہ ایچ فروختن و وبالِ نظارہ آیندگان
 بہ سلم خزیدن؛ و در شوقِ ثانی اندیشہ می سجد کہ رفتگان چه بردہ اند و گذشتگان
 چه یافتہ کہ مارا از دُروے آں وایہ (یعنی دیوڑہ) بقیاب وارد انصاف بالائے
 طاعت ست۔ بدعوئی گاہے کہ توانائیِ قلیل را بغر و ہیدگیِ فرہنگ
 (یعنی بہ پسندیدگیِ روش) مسلم داشتہ و لوای نورالعین واقف بشیوائیِ شیوہ
 (یعنی بخوبی طرز) برافراشتہ باشند باکہ باید گفت کہ نتایجِ طبع ماکہائی است
 و مارا چه لذت دریں حکر عالی ست۔ سطرے چند بیابا بگی دیوان ریختہ
 کسوتِ حرف و رقم پوشیدہ، و دودِ سوداے کہ بہ آرایشِ سفیدہ موسوم
 بہ گل رعنا از سویدا جوشیدہ است، ارمغانِ فرستم و از شرمِ تنگ مایگی
 آب میگردم۔ والسلام

شیخ امام بخش ناسخ نے اپنا دوسرا دیوان میر موسی جان کے ہاتھ
 مرزا کو بھیجا ہے، اس کی رسید اس طرح لکھتے ہیں،

دریں ہنگام کہ فروماندگی از اندازہ گذشتہ دل بہ افسردگیِ خوی
 گرفتہ است، ندانم چه می نگارم و چه می نگرم کہ دریں بگرہ بستن بنگہ از
 نازِ بدیدہ در نمی گنجد، و دریں نگارشِ خامہ از شادیِ درُبان (سرانگشت)
 می رقصد۔ بخت را بہ رسائی ستایم و پندارم کہ بطورِ معنی رسیدہ ام۔ خود را
 بگراں مایگیِ آفریں گویم و انگارم کہ موسی را با دیدِ بیضا دیدہ ام۔ اگر مخدوم
 مرا بگرفتَن عیارِ ایں دعویِ حیرتے روے دہد؛ و ایں مایہ بالا خوانی و
 خود سنائی از من عجب آید، گویم ہاں انصاف، سخن بکنایہ می سراہیم

نہ بگڑاں۔ موسیٰ اشارہ بہ سیدی مکرمی میر موسیٰ جان ست؛ وید بیضا
عبارت از دیوان فروغانی عنوان۔

”نسب دیوان کہ مادرش از دورہ چراغ طورست، و غلافش از دیبا کے
معدہ حور۔ قلم ہم معنی را سفینہ است، و جواہر مضمون را گنجینہ... سہمان اللہ
سخن بہ روزگار مخدوم بہ پایہ بلند رسید، و اردو را رونق دیگر پیدا آمد۔ ایک
نارسیدین نامہ من بخاطر عاظر جائے گرفت، و شکوہ آں بہ زبان قلم رفت،
مرا آبرو افزود۔ و از دش مرا در نظم جلوہ گر ساخت۔ خوشامن کہ در آن چشم و
دلہم جائے باشد، و چون نامہ من نہ رسد بازو اززد۔ گردہ سر این نوازش گرم
و بریں پرکشش جاں برافشانم...“

مولانا فضل حق مرحوم کے مکان کے قریب آگ لگنے کی خبر مرزا کو
بندوبست خط موسومہ لالہ ہیرالال کے معلوم ہوئی ہے، اس پر مولانا ممدوح کو
اس طرح لکھتے ہیں:

”قبلہ و کعبہ! اگر ایں نہ بودے کہ لالہ ہیرالال را ہواے دیدن عنقا
در سر، و ناگاہ شامگاہے بہ نشیمن تنہائی من گذرافتادے، آں در گرفتن
آتش گرداگرد والا کاشانہ و سوختن خانہ و رخت ہمایگاں از ہر کرانہ۔
و نہ رسیدن آئیے بکلا زمان در آں میانہ، از کجا شنودے، و اگر نہ شنودے
ہر آئینہ ہم جت دوستانہ پرکشش کہ شیوہ غم خواری و اندوہ ربائی است۔
ناگزاردہ ماندے۔ و ہم ایزدی نیایش کہ لازمہ حق شناسی و سپاسگزاری
است، بتقدیم نرسیدے۔ ہاں! اے وفادار شمن! بیگانگاں (چوں لالہ
ہیرالال) کا سیلابِ پیام و نامہ، و آشنایاں مگر تشنہ رش و خامہ:
و اے برمن کہ رقیب از تو بہ من بنماید نامہ و اشعدہ، مہر بہ عنوان زدہ

"ہمانا آن سوزندہ آذر سرگرمی شوق از من فراگرفتہ بود کہ بیتابانہ
 گرد سرگردید، و اندراں آشتلم (شدت)، زبانہ و شرارہ در خویشتن نگہداشت۔
 ہیہات من کجا و این ہمہ دعویٰ بلند از کجا! خونمایاے گمان تاثیر مہر و فاست
 کہ مرا بدیں رنگ ہرزہ لاسے و یافتہ سراسے دارد، ورنہ آنرا کہ از شعلہ آہ
 مگر سوختگان دامن نہ سوزد، عجب نیست اگر آتش افروختہ پیرامن نہ سوزد
 شکوہ پیشکش، و پینارہ (طعن) بر طوفان خداے توانا را شکر گویم کہ بلاے
 بے زینہار از بندگان خویش بگرداند، و تا بے بصراں را دیدہ و دیدہ وراں
 را سرمہ بدست افتد۔ کرشمہ نیروے جبریل و معجزہ آسودگی خلیل را
 در نظر ہا تازہ کرد۔۔۔۔۔ اگر دانستے کہ پیش خود شرمساری نخواہم کشید،
 و مرا اندرین محال طلبی بر من زبان طعن دراز نخواہد شد، ازاں مخدوم
 بے عنایت پاسخ این نامہ و تفصیل این ہنگامہ درخواستے و پرسیدے کہ
 در اں ہنگام کہ آتش زبانہ زد، و نگہ بسراغ تیرگی دودے و تابش نمودے
 فرامید، شاہ چہ می کردید؟ و نور چشم مردی و فرزانی مولوی عبدالحق
 کہا بود؟ و پس از آنکہ رشتہ در ہمسایہ آشکار شد، و ہزار ہزار انجمن
 افتاد، سرا سیمکی درونی پرستاراں و بیتابی برونی ہواداراں چہ قیامت
 آورد؟ و ایہ ہمہ آشوب چہ مایہ دیر کشید؟ و فرجام کار کہ مژدہ ایمنی
 دادند۔ بر کارخانہ دواب و بنہ و بار کہا راں (یعنی اسباب ایشان) کہ
 اینہارا جز بہ اطراف کاشانہ محل نیست، و بیشتر ازینہا طعمہ آتش بلکہ
 افروزینہ (ایندھن) آتش ست، چہ گزشت؟ لیکن چون ارزش التفات

از من سلب کردہ ، و مرانیک در دل فرود آورده اند کہ عالیاں دران
گوشہ خاطر م جائے نماندہ ۔ ہرچہ گفتہ ام بطریق آرزو ستانہ بہ سبیل
سوال ۔ والسلام“

نواب مصطفیٰ خان مرحوم کے خط کا جواب جس میں شوقِ ملاقات
اور غزل تازہ کی خواہش ظاہر کی ہے ، اس کے آدل اور آخر کے فقرے یہ ہیں :
”سحرگاہ ہے کہ دلم از دردِ شائہ چنانکہ مومن ہر پیشہ از رنج ہمسایہ در آزار
باشد ، بقرار بود ، و دستم از اشتہم بیتابی دل رعشہ دار ؛ فرخندہ سروشہ از
در در آمد ، و سپردن بہار سامان نامہ گل بہ جیب تمنتار بخت بہر چند نامہ سپار
مس امید را کیمیا ، و دیدہ جاں را توتیا آورد ، تارک اقبال را افسر
و پیکر آرزو را زیور بخشید ، لیکن از آنجا کہ آں قدسی مفاوضہ از شور
و غزل ، چوں نامہ اعمال زلہ از ذکرے و شاہد سارہ بود ، دل سودازہ بدل
نیا سود ، و خام بدان یکدو جروہ صہبا شکست گفتہ ہے ہے ، نہ مژدہ دیدارے
کہ دل بہ نشاط آں توان بستن ، و نہ کرشمہ غزلے کہ لب بہ زمزمہ آں توان کشودن
امید کہ ازیں بعد زود نہ دیر ، بانشای غزل شادم فرمایند ، و نوید رو بکوتاہی نہادن
روز فراق کہ اندرین موسم کہ خسرو انجم بہ اسد جائے وارو و عجب نیست بفرستند
دلت و اقبال روز افزوں باد“

۱ دل کو مومن اور شائہ کو ہمسایہ سے تشبیہ دی ہے ۔

۲ یہ خط مرزا نے اس وقت لکھا ہے جب کہ آفتاب بروج اسد میں تھا ۔ چونکہ اسد
مرزا کا تخلص اور ان کے نام کا جزو ہے ، اس لیے آفتاب کے بروج اسد میں ہونے
سے یہ شگون یا ہے کہ ایسے وقت میں آپ کا مجھ سے ملنا کچھ دور نہیں ہے ۔

جواب نامہ شیخ امیرالہ سرور تخلص:

”رسیدن دنوا نامہ دل را تو مند و شاخ آرزو را برو مند ساخت.
 گلا از نار سیدن پا رخ نامہ ہاے خویش می کنید و از خدا شرم نداشتید من خود
 از جانب شما بنگران داشتم کہ بجایید؟ و چه در سردارید؟ بارے پردہ
 از روے کار شما برگزتم، و دانستم کہ یک چند مرا فراموش کرده بودید
 ناگاہ ورود جناب مولانا تراب علی بدان بقعہ افتاد شنیدید کہ فلانی
 یعنی غالب، از سخت جانی هنوز زندہ است، ہر کہن بجنبید! خواستید کہ نامہ
 یاد آوری۔ از فراموشی روزگار گذشتہ اندیشہ کردید، لاجرم دروغ چند بر ہم
 بافتید و آن را دیباے دیباچہ نامہ ساختید۔ از حال من پرسید اید۔ چہ گویم
 کہ بگفتن نیز د۔ چنانکہ گفتہ اند:

شکستہ دل ترازاں ساغر بلورینم کہ در میانہ خار کئی ز دور رہا
 خیرہ سرا و آشفہ راے، ز زبان سخن سرے، و نہ دل از سراسیمگی بر جاے۔
 چہار سال می گزر د کہ مقدمہ من با جلاہ کونسل در پیش ست، و دلم از
 تفرقا بیم و امید ریش۔ حکمے کہ قطع خصومت تواند کرد، بر نیامد، و ہنگام
 بہ پایاں رسیدن تیرہ شب ناامیدی در نیامد۔ عایا براں سرم کہ چون
 جزو اعظم کونسل اشرف الامرا لارڈ ولیم کونڈس بشنک بہادر بدیں رہا
 نہ آید، بدافش در آدیزم و داد خواہم، و استدعاے صدور حکیم اخیر کنم۔
 گروہے بر آنند کہ نواب عالی جناب بہ دہلی نخواہد آمد، و ہم ازاں رہنڈ ہا
 بہ اجمیر خواہد رفت۔ اگر ہمچنین ست بدامین روزگار من و آدخ از دوری
 راہ و درازی کار من۔

”خواستہ آید کہ نتایج طبع والاے شما بنگرم و از ترا ویدہ ہاے کام و

زبان خود بشمار معانی فرستم۔ فرصت آں کجا؟ و دماغ این گو؟ آمد آمد
نواب گورنر، و در یوزہ اخبار از ہر روز، ترتیب افراد مقدمہ، و تمہید نگارش
حال، بنجیدن اندیشہ ہائے رنگارنگ، و سگالیدن اندازہ بیان، آں مایہ
دستیاری و غمخواری از کسے چشم نہ دارم کہ چوں ورقے انشا کردہ باشم، نقل
آں تواند برداشت، با چوں دفترے از ہر نگریستن پریشاں کنم، آں اوراق پگندہ
رافراہم تواند کرد۔ بہر رنگ چند روز دگر معان دارید و تا زمانیکہ بمن پیوندید
گاہ گاہ یہ نامہ رنگ زدائے آئینہ و دار باشد۔

مولوی سراج الدین احمد لکھنوی جو کلکتے میں کسی عمدہ خدمت پر متنازع
ہیں اور مرزا نے نہایت سچے اور گاڑھے دوست ہیں، ان کو نواب امین الدین
خان مرحوم کے باب میں جب کہ وہ رئیس فیروز پور جھوکہ کے خلاف اپنے مقدمہ
کی پیروی کے لیے کلکتے گئے ہیں، اس طرح لکھتے ہیں:

”مخدوم غالب! اگر نہ اندوہ سترگ بند بردلم نہادہ بودے، من دامن
و دل کہ در شکوہ چہ روش با ایجاد و در گلہ چہ عریبہ با بنیاد کردے جسوزشا
(یعنی سویشما) در ناکاہی من ست (جس کے سبب سے شکوہ کرنے کی فرصت
نہیں ہے)، ورنہ اگر تاب و تواں داشتے، آں قدر با شما در آؤنختے کرشما را
دامن و گریبان بنیاں رفتے، و مراسر درد شکستے۔ آخر از خدا تیرید
واز رُوسے دار بنجید کہ کار من و شما بدار رسد کہ روز ہا بگذرد و بہ نامہ
یاد نگردم۔ گفتم (یعنی میں ادھر کہ چکا ہوں) کہ در بند گزارش اندوہ ہے تازہ ام
شکوہ کجا بخاطر ناشاد می رسد۔ اگر چہ اندیس ورق گنجائی این وسط نیز
نہ بود، لیکن اندیشہ بدار پیچید کہ مبادا دوست ادا نشناس من مرا از خود
خرسند داند و بدیں گمان از تلافی فارغ باشد و من زیاں زدہ جاوید

گستاخ امید باشم

”بالجملہ دریں نامہ نگاری مدعاے اصلی بدیں رنگ ست کہ برادر صاحب مشفق نواب امین الدین احمد خان بہادر ابن فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ راہماں موج بلا کہ زور تم شکستہ بود (یعنی تعدی رئیس فیروز پور) خانہ بسلاب فنا دار۔ خون و فایم بگردن کہ دریں سفر از ہماییش باز ماندم۔ و اما ندگی و بیچارگی من از اینجا تو اں سنجید کہ دندان بر عکس نہم، و امین الدین احمد خان رادہ سفر تھا گرام۔ اگر قاضی محبت بدیں جرم بر نظم نشاندا، و بہ تیغ بدریغ خونم ریندا سزا دلدا و لطف درین ست کہ ہر چند دریں باب بگفتار گرایم، و ہنگامہ پوزش آرایم، شرمساری بیشتر گردد و فحلت افزاید۔ مگر سراج الدین احمد بہ تلافی برخیزد، تا از گراہی تشویر (شرمندگی) بکشدش گروم، و گرد فحلت از چہرہ برفاشانم، یعنی کمر بہ غنچواری و رہرو نوازی استوار بندید، و خود را دوست دیرینہ امین الدین خان دانستہ آن چناں چارہ سازی و سگالش گری بجای آرید کہ ایں درد مند دور از خانماں (یعنی امین الدین خان) اسد اللہ رویاہ را فراموش کند، و شمارا بجای او داند۔ و نیز بہ برادر والا قدر گفتہ شدہ است کہ چون بہ کلکتہ رسید و شمارا دریا بد، داند کہ اسد اللہ پیش از دو بہ کلکتہ رسیدہ است۔ قطع نظر از ایں مدارج کہ بر شمر دم، آخر خدائے ہست و دادے ہست! افسانہ ناکامی و ستم کشی ایں فروغ ناصیہ سعادت یعنی امین الدین احمد خان عارہ رادل بگذارد، و آہن را آب گرداند۔“

دوسرا خط مولوی سراج الدین احمد کے نام اس طرح شروع کرتے ہیں:

”گو ہر آگیں نامہ و لنوازی پس از روزگارے دراز رسید و دیدہ دل را

فروغ و فراغ بخشید۔ نارسیدن نامہ مرا با فسر دگی شو قم حمل کردید چرایم برگ
 من حمل نہ کردید، تا از ادراشناسی ہای شما خرسند بودے و شمارا اہل دل
 و دانشور شمردے۔ من و ایمان من کہ ریشہ ہر شاہ بہ مغز دل و دیدہ و
 محبت شما با جان در آمیختہ۔ تازندہ ام، بندہ ام۔ وفا آئین من ست،
 و مودت دین من ست۔ اگر در نگارش نامہ درنگے روے دید، بر فراموشی
 محمول نہ شود۔ رد ہا در دل، و ہنگامہ ہا در نظر، و تفرقہ ہا در خاطر، و سودا ہا
 در سر۔ چہ گویم چہ می کنم، و روز و شب چگونہ بسر می برم“

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو استرلنگ صاحب
 فارن سکریٹری گورنمنٹ کی وفات پر اس طرح لکھتے ہیں:

”عمر من و جان من! پس از رسیدن گرامی نامہ دبندہ آں بودم کہ
 پاشخ گزار شوم و ماجرای خود شرح دہم۔ ناگہاں دی کہ دو شنبہ پانزدہم
 ذی الحجہ بود، آوازہ در افتاد کہ مجموعہ مکارم اخلاق را شیرازہ وجود از
 ہم گسیخت، شمع ایوان سروری مُرد، و نہال باغ آگہی را برگ و بار فوراً بختہ
 و ستگیر در ماندگان را دست از کار رفت، و گرہ کشای بستہ کاراں را نے
 بناخن شکست۔ خاکم بدہن، چگونہ گویم؟ و اگر من نہ گویم کیست کہ نمیداند کہ
 متراند و استرلنگ مُرد، و از گیتی جز نام نیک با خود نبرد کاش، روے
 گداختہ (پگھلی ہوئی کاشی) بروزد، گو شمع رہ بختہ دے، تا نہ شنودے کہ چہ شد
 اکنون امید غمخواری از کہ بایدم داشت، و دل را بنیال گردش چشم کہ تسکین
 داد۔ پوئے کہ فرانسس آکنس بہادر خصوص داد خواہی من بہ صد فرستادہ
 است چہ گویم کہ چہ امید کاہ و اندوہ فراے بورہ است۔ بر کار سازی آں
 چاکب خرام بیدای فنا (یعنی استرلنگ) داشتہم۔ اکنون از شش سو فلک

ہنگام دشمن ست۔ زینہار درپاسخ این نامہ درنگ روا مدارید، و بنویسید کہ
آں والا گہرا چہ زوے داد و آں گلبن روضہ مردمی را کدام تند باد
از باغ کند، و پس از وے سرانجام دفتر کردہ چہ شد و جایش کہ گرفتہ
اللہ بس ماسوی ہوس :

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو اپنے ایک کلکتے کے
دوست مرزا احمد بیگ کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں :

"والا نامہ رسید، و نوید فراق دائمی مرزا احمد رسانید چہ مایہ سنگین دل
و سخت جانم کہ نامہ در تعزیت دوست انشائی کنم، و اجزائے وجودم از ہم نمی
ریزد۔ می گفت کہ بدہی می آیم۔ و عدہ فراموشی بیروت راہ گرداند، و ناوہ
بسر منزل دیگر اند۔ گرفتہ کہ خاطر دوستان عزیز نہاشت، چہ بحال خردسالان
خود نپرداخت و سایہ از برشاں باز گرفت۔ و اسے بے یاری یاران وے،
و درینا بے پدی پسران وے۔ ہر چند از مرگ نتوان ناید، و گسستن تار و
پود پندار ہستی را چارہ نتوان کرد، لیکن انصاف بالائے طاعت است،
ہونہ ہنگام مردن مرزا احمد بود۔ چہ آں قدم صبر نہ کرد کہ بہ کلکتہ رسیدے
و وے نظارہ فروزش دگر بارہ دیدے ! چہ آں مایہ درنگ نہ ورزید
کہ حامد علی جوان گشتے، و کار ہا بہ اندازہ دانش وے رواں گشتے !
حیف کہ بہین پسر خردسال ست و باشد کہ بہ حقیقت سرمایہ پدر وانا
و گمراہ آوردن زدے پراگندہ توانا نباشد۔ و باشد کہ چوں آں سرمایہ بہ
چنگ آرد، باد دہد، و بر فرورستان خود ستم کند و کہیں برادران را ناکام
گزارد۔ ہر آئینہ دریں حال ایمنے باید ہوشمند و حق شناس کہ گرو چارہ برآید
غمواری بے پدر ماندگان نماید۔ اللہ در من قال :

مرا باشد از دردِ طفلانِ خبر کہ در طفلی از سر برستم پدر
 وانش کہ تیمار آن بیچارگانِ عینِ فرض و فرضِ عینِ ست ہم بر شما و ہم بر
 مرزا ابوالقاسم خان۔ بیکسی این جا و در نظر باید داشت، و غافل نباید بود
 ان الله لا یضیع اجر المحسنین“

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین احمد سے دوستانہ شکایت
 اس طرح کرتے ہیں:

”ذیہار، صد ذیہار، اے مولوی سراج الدین! بترس از خداے جهان
 آفریں کہ چون قیامت قائم گردد و آفریدگار بنشیند، من گریان و مویہ کنان
 در آن ہنگام آیم، و در تو آدیزم، و گویم کہ این آنکس ست کہ یک عمر
 مرا بہ محبت فریفت و دلم برد، و چون من از سادگی بروفا تکیہ کردم،
 و این را از دوستان برگزیدم، نقش کج باخت و بمن بیوفائی کرد۔ خدا را
 بگو کہ آن زمان چہ جواب خواہی داد؟ و چہ عذر پیش خواہی آورد؟
 و اے بر من کہ روزگار ہا گذرد و خبر نداشتہ باشم کہ سراج الدین احمد کجاست
 و چہ حال دارد۔ اگر جفا پیاداشی و فاست، بسم اللہ ہر قدر توانی بیغزای
 کہ این جا مہر و وفا فراوان ست، لا جرم جفا نیز، باید کہ فراوان باشد و اگر
 خود این تغافل بہ بار افراہ (یعنی پیاداشی) جرے دیگر ست، سخت
 گناہ را خاطر نشان باید کرد، و انگاہ انتقام باید کشید، تا شکوہ در میان نگنجد
 و مرا زہرہ گفتار نباشد۔ منم کہ معاش من از گونہ گون رنج و رنگ رنگ
 عذاب بمعاد کفار ماند، خون در فکر و آتش در دل و خار در پیراہن و
 خاک بر سر۔ پیچ کافر بدیں روزگار گرفتار مباد، و پیچ دشمن این خواری
 میناد۔ راست بہ تنہا روے مانم کہ در صحرا پایش بگل فرورد، و ہر چند

خواہد کہ بالا جہد، نتواند و فرود تر رود. والا قد نواب امین الدین احمد خان بہادر کہ گیتی را بر ویش دیدے، و وصالش را زندگی دانستے، بجلتہ رہگرا شد. دیگر زندگی از بہر کہ خواہم و دل را بیدار کہ شادماں دارم. و اماندگی من از اینجا توان سنجید کہ نتوانستم ہمپائیش کردن و روا داشتم، اورا تنها گزاشتم. ایک اور خط میں مولوی سراج الدین کو اپنے مقدمے کے بگڑ جانے کا حال اس طرح لکھتے ہیں:

”کار من بدادگا و دہلی، چنانکہ دانستہ باشید، تباہی گزید. عالیا براں سرم کہ اگر مرگ امان دہد، باز بدایں در (یعنی دہ سپریم کورٹ) رسم و درو دل بدایں زمزمہ فروریزم کہ مرغان ہوا و ماہیان دریا را بر خود بگریانم بیہا! اگر معاش من ہمیں پنجہزار روپیہ سالانہ ہم بدیں تفویق، از روئے دفتر سرکار ثابت شدہ بود. بایستے کہ صاحبان صدر مرا از پیش راندندے و گفتندے کہ ہرزہ مخروط، آنچه تو باز یافت و نمودہ، یا قتی ازاں افزوں تر نیست، و قرار داد نیز ہمان ست. لاجرم، دیوانہ بودے، اگر بدیں کشور باز آمدے و بایک قیلہ (یعنی با جمع کثیر) کہ خویشان و برادران من اند، بہ ستیزہ برخواستے و بہ باطل ستیزی نام برآوردے“

”چہ کنم کہ کار برگشت، و روزگار برگشت. فدارا بنگر، و بہ درو دل من وارس. کولبرک بتوسط کرنیل ہنری املاک بر من ہربان شود و پوسے کہ خوشتر ازاں نتوان اندیشید، بصدر فرستد، و جوابے کہ سودمند تر ازاں نتوان سنجید، از صدر حاصل نماید. ہنوز آں جواب در راہ باشد کہ کولبرک معزول گردد. و ہاکنس کہ بجائے کولبرک نشیند، آنچه بر ہم زدن ہنگامہ سلطنتی را بس باشد، از بہر من بصدر نویسد، و من در اں داری (معاملہ) اذا

مستراسترنگ چشم یاری داشتہ باشم۔ ہنوز آن رپوٹ بصد رسیدہ باشد کہ مستراسترنگ
بہروراہ عدم گردیدہ باشد۔ چوں از ہمہ بکسلم و بد اسن جارج سوئٹن بہادر آویزم، گرم
از عابر خیزد، و داسن بر شغل جہانباہی افشاند۔ سبحان اللہ! معز دل نگردہ مگر
کولبرک، بمرگ ناگاہ نمیرد، مگر استرنگ، بولایت نہ رود، مگر جارج سوئٹن؛
دخوہ ایں صدمہ ہائے جانگاہ نباشد، مگر اسد اللہ داد خواہ۔۔۔۔۔

مولوی سراج الدین احمد کے نام ایک اور خط:

”دلتوا از نامہ پس از عمرے رسید، و عمرے دیگر بخشید تا عمر باندوہ پری
شدہ را تلافی تواند کرد۔ اما شاد کردن دے کہ نہادش بہ غم سرشتہ باشد،
نہ آسان ست۔ منم کہ چوں نامہ شمار رسیدے، مستانہ از جابے بر جستے،
و جہاں جہاں نشاط اندوختے، ایک تا چشم بہ سواد ایں صمیمہ دو چار شد،
گیتی در نظم تیرہ و تار شد۔ نخست آنچہ بنظر در آمد، خرد آشوب خبرے
کہ دل تا بگر خون کرد۔ یعنی از جہاں رفتن خواہر عزیز شائے ہے امجدہ
مرحومہ بہان ست کہ تا در کھلتہ خبر رنجوری دے شنودہ بودید، دل از دست
رفتہ بود، و سرا سبگی سراپاے خاطر را فرورفتہ۔ در نظر دارم کہ از مردنش
بر شما چہ قیامت گذشتہ باشد۔ توانا ایزد پاک شمارا شکیب عطا فرماید و تونری
دل و توفیق ثبات از دانی دارد، و ایں سانچہ را در روز نامہ عمر شما خانہ مکارہ
و مقطع مصائب گرداند۔

”آشکارا شد کہ مخدوم! مرا از علاوہ تازہ خوشنودی نیست۔ ہر آیینہ
انکشاف ایں معنی غبار طلال بر دل فرورخت۔ فدارا دل تنگ نتوان شد،
و کھلتہ را غنیمت باید پنداشت۔ شادستانے (معموہ) بدیں تازگی در گیتی
کجاست؟ خاک نشینی آن دیار از اورنگ آراہی مرز بوم دیگر خوشتر من

و خدا کہ اگر متاہل نہ بودے ، و طوق ناموس عیال بگردن نہ داشتے ، دامن
بر ہر چہ ہست ، افشانہ دے ، و خود را در اں بقعہ رساندے . تازیستے در اں مینو
کدہ بودے ، و از رنج ہواہای ناخوش آسودے . زہے ہواہای سرد و
خوشا آبہای گوارا ، فرخا بارہاے ناب و خرما ثمرہاے پیش رس :

ہمہ گر میوہ فردوس بخوانست باشد غالب ! آں انبیا بنگالہ فراموش مباد
مولوی سراج الدین کو مرزا صاحب نے کسی واقعے کا قطعہ تار سنج
لکھ کر بھیجا ہے اور انھوں نے بغیر خواہش مرزا صاحب کے وہ قطعہ بہت
سی مدح و ستائش کے ساتھ اخبار آئینہ سکندر میں چھپوایا ہے . جب وہ
پرچہ مرزا کی نظر سے گزرا ہے ، تو اس کا شکریہ اور ایک اور خبر کے ”ج کرنے
کی درخواست اس طرح کی ہے :

”گنہائے رانا مور ساختن ، ویسے را ہمہ پنداشتن ، عنایتے ست سترگ و
مرحتے ست بزرگ ، خاتمہ کہ آں سترگ عنایت بے ابرام داعی روئے نماید ،
و آں بزرگ مرحتے بے استدعائے سائل بنظور آید . نگرندہ اگر دیدہ حق
بین دارد ، بگرد کہ واجب تعالی شانہ ، اجزائے مملکت را کہ در کتب عدم
متواری بودہ اند ، بمحض عنایت پیرایہ وجود بخشیدہ ، و بران معدومات منت
نہادہ . حقا اگر تاملے بسزا کردہ شود ، رقم گشتن قطعہ تار سنج در آئینہ سکند
ازیں عالم خبری دہد . و چون نا خواستہ اینچنین نوازش بمیان آمد ، ہر آئینہ
روانی خواہش را چگونہ چشم نتوان داشت ؛ لا جرم در گزارش مدعا فصلے
بمیان نہادہ آرزو را سرانجام گفتگو دادہ می شود .

”نہفتہ مباد کہ قدر شناسی حکام رنگ آں ریخت کہ فاضل بے نظیر
و الہی یگانہ مولوی فضل حق از سرشتہ داری عدالت دہلی استعفا کردہ ،

خود را از تنگ و عار و رباوند - حقا کہ اگر از پایہ علم و فضل و دانش و کنتش مولوی فضل حق آں مایہ بکا ہند کہ از صد ایک واماندہ ، و باز آں پایہ را بسر رشتہ داری عدالت دیوانی سنجند ، ہنوز این عہدہ دون مرتبہ و سہ خواہد بود - یا بجلد بعد ازین استعفا نواب فیض محمد خان در رئیس جمہر پانصد روپیہ ماہانہ برائے مصارف خدام مخدومی معین کرد و نزد خود خواند - روزیکہ مولوی فضل حق ازین دیار می رفت ، ولیعہد خسرو دہلی صاحب عالم مرزا ابو ظفر بہادر مولانا را تا پیرود کند ، سوسے خود طلبید ، و دو شالہ ملبوس خاص بدوش و سہ نہاد ، و آب در دیدہ گرداند ، و فرمود کہ " ہر گاہ شامی گوید کہ من رخصت می شوم ، مرا جز اینکہ پذیرم ، گریز نیست - اما ایزد دانا داند کہ لفظ و داع بہ زبان غیر سہ الا لیسجد جز ثقیل " تا اینجا سخن ولیعہد بہادرست - غالب مستہام از شامی خواہد کہ واقوہ تو دلیح مولوی فضل حق ، و اندوہ ناکی ولیعہد بہادر ، و بدد آمدن دلہائے اہل شہر ، بعبارتے روشن د بیانے دلاویز در آئینہ سکندر بقالب طبع در آرید و مرادریں تفقہ سنت پذیر انگارید و السلام "

مولوی سراج الدین احمد نے خط اس مضمون کا بھیجا ہے کہ مرزا صاحب کچھ حالات پارسیوں کے اسلاف کے لکھیں اور کوئی ایسی کتاب کا نشان دیں جس سے ان کے مفصل حالات معلوم ہوں ؛ نیز کسی تذکرے میں درج کرنے کے لیے مرزا کے اشعار کا انتخاب اور خود مرزا کا ترجمہ طلب کیا ہے - اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں :

" ہر نیسے کہ ز کوئے تو بخاکم گذرد یارم از دلولہ عمر سبکتاز دہد

رسیدن ہر افزا نامہ دل برد ، و جاں بخشیہ اگر چہ آں جان با من نہاند ، و ہم بر سر آں نامہ بہ فشاندن رفت ، لیکن سپاہ دہر مائی و جاں بخشی باقی ست

اتید که تا جان بخشیده یزدان در تن ست، گزارده آید.

”مخدوم من در رسیدن نامه پیشین و و دل (مترود) چراست؟ هنوزم نشاط و رور آں نمیتد در دل، و سوارِ سطورِ آں صمیمت در نظر جادارد. چون فرماں چنان بود (یعنی نه نامه پیشین) که غالبِ خویشتن نشناس لخته از رسم و راونرگانِ پارس برگوید، و کتابے ازاں گروه نشان دهد که رازِ آں دیرین کیش و سازِ این باستانی زبان، ازاں اوراقِ توان یافت. لا جرم دانش من (علم من) اندازه سرانجام پاسخ آں برتافت (تحمل نکرد) چون دوباره گفتند که خواہش چنین ست، تا چارہ بر خموشی از دہان و پردہ شرمِ نادانی از میاں برداشته، میگویم کہ روائِ این خواہش از هیچ کس چشم نتوان داشت، و خود را بہ بندِ این پژوهش (تلاش) خستہ نتوان کرد. نگارندہ دبستانِ مذاہب با اینہمہ لانِ آشاروی (واقعیت) آنچه می گوید، نہ ہماست نہ ہما بر جای خودست (یعنی نہ مکمل ست و نہ سراپا صحیح ست) پارسیاں در سورت و بمبئی آشیان دارند، زمینہار گمان نبری کہ ازاں گروه (یعنی از سترگانِ پارس) جز نام، نشان دارند. آں پویہ و آں ہنجار (یعنی آں روش و آں طریق) و آں نگارش و آں گفتار ندانند، و جز تخمہ و نژاد از رُوسِ شیوہ پارسیاں نہمانند. پارسیاں از گرانمایگانِ روزگار و برگزیدگانِ دوارِ بودہ اند، و بہ روزگارِ فرماں روائی خوش دانستہا سودمند و علومِ مفیدہ، و کنشہاے خرد پسند (اخلاقِ پسندیدہ) داشتند. کثایش رازِ خرامشِ ہفت پہر، و نمایشِ اندازہ گردشِ ماہ و مہرِ پدید آوردنِ رخشندہ گہرہا از ہر خاک، و بدر کشیدنِ بادِ ناب از رگِ تاک، پژوهشِ اسبابِ خستگی و رنجوری، و گزارشِ احکامِ پزشکی (طبابت) و چارہ گری، پردہ کشائیِ فہرستِ اسرارِ کیائی (سلطنت) و فرماندہی، و

رصد بندی تقویم آثارِ بندگی و فرمانبری، عنوانِ یک دگر بستنِ رنگ
 رنگ گہرا، و ہنجاہ سرہ کردنِ گونہ گون ہنرا، دلز و گیاہ فراخوہ ہر درد بکار
 اندہ آوردن، و پرندگان ہوا و درندگان دشت را بہ شکار اندہ آوردن
 کوتاہی سخن، والائی انداز ہر گونہ بنیش، و پیدائی اندازہ کمالِ آفرینش
 ہمہ در آئینہ اندیشہ این فزائنگاں رُوسے نمودہ۔ و انگیزش با یستکی گفتار
 و کردار کہ اکنوں بہ اندکے ازاں بسیار نازند، از مغیر دانش این فرہنگیال
 بودہ است۔ گنجینہ خسروانِ پارس را از ہر علم و فن ترے بود و ہر دفر از گرانماگی
 گنج گوہرے۔ چوں دولت ازاں طائفہ رُوسے بر تافت و سکندر ابنِ فیلقوس
 بر ایران دست یافت، کتب خاصہ خسروی بتاراج رفت۔ اما آنچہ پراگندہ بود
 و گنماں بہر گوشہ و کنار داشتند، برجا ماند، تا بہ روزگارِ پیروزیِ تازیان
 دراں کشش و کوشش از ہر جا گرد آمد (فرہم آمد) و بر فرمانِ خلیفہ
 افروزینہ گلخن گریا بہاے (حمام ہاے) بغداد شد۔ ہمانا احکامِ آذر پستی
 ہم بہ آذر بازگشت۔ زبانِ آورانِ عربِ پارسی را بتازی آمیختند، و زبانے
 تازہ برا نگینند۔ اکنوں کیست تا بجاں زبانِ کہن سخن درست تواند گفت
 و ازاں دیریں آیینِ راستی خبر تواند داد۔ پشود ہندہ این راز را کامِ دل
 بر نیاید، و من ضامن کہ ہر چہ پس از فراواں جستجو فرہم آرد، نہ آنچنان باشد
 کہ دل بجاں توان نہاد۔

”دیگر آنچہ کلکِ مشکبار بجاں رفتہ کہ منتخبے از گفتارِ نارواے خود برنگام
 و نختے از ماجراے خو بر گزارم، اندیشہ را بہ لب گزیدن و خرد را بشکفت
 زار در محلِ تعجب، افکند؛

چکویم از دل و جانے کہ در بساطِ من است تم رسیدہ یکے، تا امیدار یکے

از چہ بدان ارم و مرا این پایہ از کجا باشد کہ ستودگان راستایند و گفتار
 مراد تذکرہ شعرا جا دهند۔ از فرجام فرہندی ہستی (یعنی از شان و شکوہ
 ہستی) و سرو برگ پیدائی کہ نزد آشکارا بیناں زود زوال، دیوالا دید
 یکتا گزیناں (یعنی قائلانِ وحدت و جود) نمود بے بودست۔ آنچه بمن
 دارہ اند، زبانے ست یافتہ سرائے و خامہ ایست پیہودہ پوسے۔ من ہم
 از بے مایگی چوں کودکان کہ درم از سقال سازند و بہ گنجینہ داری نازند
 سرودہ زبان و پیہودہ خامہ را (یعنی کلام خود را)، پارہ پارہ بہم بستہ
 و ریزہ ریزہ یکجا کردہ، بگمان نام آوری کہ دل از تاب اندوہ ناروائی
 آن خون ست۔ دیوانے ترتیب دارہ، با بجا بنظر گاہ انتفات یاراں
 فرستارہ ام۔ بزرگانے کہ بہ پرستش غالب مستند رُوسے آرند، سوار
 ہر غزلے کہ خواہند، ازاں اوراق بردارند کہ انتخاب و التقاط اشعار حوالہ
 بہ راسے نامہ گرد آور (یعنی موقت تذکرہ) است نہ باشارہ و ایماے
 سخنور۔۔۔۔۔ اما اگر گزارش عال سخنور ہوس ست، خود این مایہ
 بس ست کہ چوں در جریدہ آن فن از من سخن رانند، سخن را در ستایش
 من بدیں گونہ بہ کرسی نشانند کہ از ناکسان روزگار و بیکسان دہلی
 دیار، مسلمان زادہ ایست کافر ماجرا و گبریت مسلمان نما، کہ از غلط نمائی
 غالب تخلص می کند و بدیں رنگ تراژمی نماید :

فرہندی غالب نبود زہنہ گفتن یک بار بفرمائی کہ ای میچاپس ما!

پنہاں نہاں کہ در اصل آفرینش از دودہ روز فرو رفتگان، و ملکہ بخت
 برگشتگان، ستم رسیدہ و رُوسے بہی نادیدہ گسٹم، آرایش سخن پتیش کش
 (یعنی بر طرث) ترک نژادم، و نسب من با فراسیاب و پیشک می پیوندند۔

بزرگان من از آنجا که با سلجوقیان پیوند هم گوهری داشتند، و بعد دولت
 اینان رایت سروری و سپیدی افراشتند. بعد پیری شدن روزگار جاه مندی
 آن گروه (یعنی سلجوقیان) چونا روائی (کساد بازاری) و بینوائی رُوس
 آورد. جمعی را ذوق رهنی و غارتگری از جا ببرد، و طائفه راکشاوری
 پیشه گشت. نیاگان مرا به توران زمین، شهر سمرقند آرامشگاه شد. ازاں
 میان نیلے من از پدر خود رنجیده آهنگ هند کرد، و به لاهور برای معین الملک گزید چون بساط دولت
 معین الملک در نوشتند، بدلی آمد، و با ذوالفقار الدوله میرزا نجف خان
 بهادر پیوست. زان پس پدرم عبداللہ بیگ خان بشاہجہان آباد بوجود آمد،
 و من به اکبر آباد. چون پنج سال از عمر من گذشت، پدر از ترم سایہ برگرفت.
 عثم من نصر اللہ بیگ خان چون خواست که مرا به ناز پرورد، ناگاہ مرگش
 فراز آمد. کما بیش پنج سال پس از گذشتن برادر بے مہین برادر برداشت،
 و مرادریں خراب جانتها گذاشت. و ایں حادثہ کہ مرانسانہ جاں گدازی
 و گردوں را کینہ بازی بود در سال ہزار و ہشت صد و شش عیسوی بہنگام
 ہنگامہ لشکر آرائی و کشور کشائی صمصام الدولہ جرنیل لارڈ لیک بہادر
 بروے کار آمد. چون عثم مرحوم از دولتیان دولت اہل فرنگ و بابائے
 چار صد سوار برکاب صمصام الدولہ، با سرکشاں سرگرم جنگ بود، و ہم از
 بخشش ہائے سرکار انگریزی دو پرگنہ سیر حاصل از مضافات اکبر آباد،
 بہ جاگیر داشت. سپہ سالار سرکار انگلشیہ بہ خونہائے آفتاب (یعنی نصر اللہ
 بیگ خان)، کلہ تار گدایان را چراغ و مابینوایان را بعوض جاگیر مشاہرہ
 از خار خار جستجوے و جہم عاشش فراغ بخشید. تا امروز کہ شمارہ نفس شماری
 زندگانی بہ چل و چار میرسد، بدان راتہ فرسندم، و بدان مایہ قانع.

در سخن از پرورش یانندگان مبداء فیاضم، و سواد معنی را بفروغ گوهر خویش
روشن کرده ام۔ از پیچ آفریده حق آموزگاریم بگردن و بار منت رہنمایم
بر دوش نیست۔

غالب بگہر ز دودہ زاد شمم زان رو بصفائی دم تیغست دم
چوں رفت سپیدی ز دم چنگ بشعر شد تیر شکستہ نیا گاہ قلم
نامہ بہ پایاں رسید، و شرم پر آگندہ گوی و دراز نفسی بر من آشتلم کرد۔ دیدہ و را
راند کہ گفتنی فراوان بود، و افسانہ پریشاں، تا کجا اندک گفتی، و گفتار را از
درازی نگاہداشتی۔ مراد را آنچه رفت، گنبدے نیست۔ و اگر خود گناہ ست،
دوست کریم رست و کرم عذر خواہ۔ والسلام :

منشی جواہر سنگہ جوہر تخلص کے باپ رے جھمل دہلوی نے مرزا کو
جب کہ وہ کلکتے میں ہیں، ایک رئیس کی نسبت جو اپنے باپ کی جگہ مستنشین
ہوا ہے، لکھا ہے کہ وہ حکیمانہ طریقہ رکھتا ہے اور سخاوت اس کی جبلت
میں ہے۔ اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں :

”ایکے گفتی، فلا نے روش حکیمانہ دارد، و دنیا را کار آگاہان می گزارد،
با این ہمہ اندوہناکی خندہ ام در گرفت، و عنان ضبط خویش از کفم بدر
رفت۔ ندانی کہ براسپان باد رفتار بر نشستن و گروہا گروہ مردم را پیشاپوش
روانیدن، تن را لباس رنگارنگ بر آراستن، و معدہ را بہ الوان
نور دنیا ممتلی گردانیدن، شہوہ از اندازہ بیرون راندن، و غبار معصیت
بر فرق افشانیدن، از حکما نیاید، و پریشانکاران را نشاید۔ کار و الشواں عیبت؛
دور از آبادی در بن کو ہے نشستن، و از شش جہت در بروے خلایق
بستن، تن را بہ ریاضت فرسودن، و جاں را بخردی پالودن۔ ہر کہ حکیم

خرد گزین ست ، کار و بارش این ست . بے برگ و نواشے از شکوہ گوناگون
 حسرت پذیر جست بہ فراخ ناسے سرخوشی (مستی) رسیدہ است ، از کجا کہ آزارہ
 و با بطبع کریم بود . هنوز ادعید منی از ریاح غلیظہ صالحہ کبدیہ متلی دارہ
 ہر آئینہ بفرمان بادست . روزے چند باش تا بگری گره بر کیسہ زر زناں
 و در حسرت زرتلف کردہ زاری کنان . این کہ فلاں و بہاں را از نزد
 خویشتن راندہ است ، حقا کہ رُوے در مصلحتی نہ داشت او ہرچہ کرد ، از
 بنمردی و ابلہی کرد . چہ اگر دانا بودے ، و خرد داشتے آناں را کہ راندہ
 است ، نہ راندے ، و کارہا از آناں گزشتے . و ایناں را کہ با خود در یکے
 پیرہن جادادہ است ، چون غبار از دامن افشاندے ، و ہرگز بہ ہواسے
 ایناں نہ رفتے . کودکی و بے حاصلی و رزید ، مگر در ایام صاحبزادگی و وچہرگی
 از آناں دلے پُر داشت و با ایناں بختے رام بود . از آناں دل بدیں
 خیرگی خالی کردن ، و در رام ایناں بدیں کوری در آمدن ، نہ بفرمان
 دانش ست ، نہ بفرمان بنیش . حکیم کرا میگوینی ؟ و کرم پیشہ کرا میخوانی ؟
 چون سخن دریں باب بسیار ست ، نامہ بہ دُعا ختم می کنم . دیدہ را
 بیشے درست و دل را دانشے سودمند روزی باد .“

مولوی محمد علی خان صدر امین باندہ جن سے مرزا باندے میں مل
 کر کلکتے روانہ ہوئے ہیں ، کلکتے میں پہنچ کر ان کو سفر کی تمام رویداد لکھی
 ہے۔ اس کے آخر میں لکھتے ہیں :

”روز سہ شنبہ چارم شعبان پارہ از روز برآمدہ در کلکتہ رسید۔
 غریب نوازیہاے وہاب بے منت را نازم کہ در چنین دیار خانہ چنانکہ
 باید ، و ہرگونہ آسائیش را بجا آید ؛ ہم اورا باندازہ فراغ خاطر آزادگان

فضائے وہم اندو مانند دہان آرز دنیا طلباں بیت الخلائے درگوشہ
 صحن پُر از آب شیریں چاہے و بر طرب بام در خور اہل تنعم آرامگاہے۔
 بے آنکہ جستوئے رود، یا گفتگوئے شود، بے منت و بے زحمت بکرایہ
 وہ روپیہ مایانہ بہم رسید، و آدم و چار دارا تکیہ گاہ آرامش گردید۔
 دو روز از رنج راہ آسودہ منشور لامع النور (یعنی سفارش نامہ
 مولوی محمد علی خان، را مشعل راو مدامہ سا ختم و در کشتی نشسته
 آہنگ ہنگی بندہ کردم۔ لطیف ملاقات نواب علی اکبر خان طباطبائی، اگر
 گویم کہ مرا از بخت محب آمد، رواست؛ و اگر گویم کہ مرا بر من بدشک
 آورد و نیز جا دارد بخدائیکہ خرد آفریدہ و خرد ور برگزیدہ، بدیں
 گراںہاگی و صاحب دلی در بنگالہ دیکرے نخواہ بود۔ یارب! ایں گوہر گرامی از کدام
 کان بہست، و ایں گرامی گوہر (گرامی ذات)، از کدامیں دودماں۔ بائے
 چون نخستیں صحبت بود، بچارہ جوئی و مصالحت پُرسی درد سر نہ ادم، و دوسرے
 ساعت نشستہ بنمکدہ باز آمد۔ آو خ (افسوس) کہ دریں روز با
 نواب را با محکام ہنگی در خصوص زمینے کہ وقف امام بارہ است
 معارضہ در پیش و دل سرگرم فکر کار خویش ست۔ و تہ دتہ القائل۔
 ہمد را مانتی حسرت دنیا دیدم چوں بعشرت کدہ گبر و مسلمان فتم
 روزگار فرمانبر و بخت فرماں پذیر باد۔

ایک اور خط میں مولوی صاحب ممدوح کو دیگر حالات کے بعد
 کلکتے کے مشاعروں اور اپنے معترضوں کا حال اس طرح لکھتے ہیں:
 ”از نوادر حالات اینکه سخنوران و نکتہ رسان ایں بقرعہ پس از ورود
 خاکسار بزم سخن آراستہ بودند۔ در ہر او شمس انگیزی روز یکشنبہ نخستیں

سنگویاں در بدر سرکار کپنی فراہم شدندے ، و غزلہاے ہندی و فارسی
 خواندندے ۔ ناگاہ گرانمایہ مردے کہ از ہرات بسفارت رسیدہ است ،
 دران انجمن می رسد ، و اشعار مرا شنودہ بہانگ بلند می ستاید ، و پرکلام
 نادرہ گویان این قلم و تبسم ہاے زیر لبی می فرماید ۔ چوں طبائع بالذات
 مفتون خود نمائی ست ، ہمگناں حسد می برند ، و کلانان انجمن و فرزائیکان
 فن بر دو بیت من اعتراض نادرست برآوردہ ، آنرا شہرت میدہند ۔ و بے آنکہ
 مرزباں پیاسخ شنا شود ، از دانشوراں کہ مخدومی و ملاذی نواب علی اکبرخان
 و مکرمی و مطاعی مولوی محمد محسن از آنانند ، جوابہا می یابند ، و پس
 زانوی خموشی می نشیند ۔ چنانچہ ہم بہ فرمان این دو بزرگوار مثنویے
 انشاکردہ ام ، و بعد از اظہار عجز و انکسار خویش جوابہاے اعلا
 دران ابیات موزوں ساختہ ، و آن مثنوی (یعنی مثنوی بار محالست)
 پسندیدہ طبع عالی افتادہ است ۔ انشاء اللہ العظیم زیں بعد مرخص کہ
 بہ والا خدمت خواہد رسید ، و رفتہ ازاں ابیات در نور دآں خواہد بود ۔
 نواب ضیاء الدین احمد خان اکبر آباد گئے ہوئے ہیں ۔ مرزا ان کو
 اپنے قدیم وطن اکبر آباد کی یاد میں دلی سے اس طرح لکھتے ہیں :
 " جانِ برادر ! اشک و آہ غالب نامراد ، یعنی آب و ہولے اکبر آباد
 بہ شما سازگار باد ۔ گرفتہ کہ خود را بسو گرفتہ (یعنی فرض کردہ اید) و نزدیک
 خود (یعنی بدانت خود) از من دورتر رفتہ آید ، اما چوں ہنوز در وطنید
 ہماناکہ نزدیک بامنید ۔ شادم کہ شوق دور اندیش دیدہ و دل را دریں
 سفر با شما فرستاد ، تا ہمدریں غربت (یعنی در دہلی) داد شادمانی دیدار وطن
 نیز توانم داد ۔ زمینہارا اکبر آباد را بچشم کم (یعنی بچشم حقارت) ننگرند ، و از

رہنڈر ہائے آن دیار، الحفیظ گوئے، والاماں سراے، گذرند کہ آن آبادچہ
 ویران و آن ویران آباد، باز یگا، ہچو من مجنوںے، و ہنوز آن بقعہ را
 دیکھت خاک چشمہ خونی ست۔ روزگارے بود کہ دراں سرزمین جز مہرگیا
 (نام رستنی) نہ رستے و پیچ نہال جز دل بار نیاوردے۔ نسیم صبح دراں
 گلکدہ (یعنی آگرہ) بہ ستانہ وزیدن، دلہا را آن مایہ از جا برانگیختے (یعنی
 بشورش آوردے)، کہ رنداں اہوائے صبحی از سرو پارسیاں را نیت
 نماز از ضمیر فرو رتختے۔ ہرچند ہر ذرہ خاک آن گل زمین را از تن پیایے
 بود و نشیں، و ہر برگ آن گلستاں را از جاں درودے بود خاطر نشان
 اما تازگی وقت شہا در نظر داشتہ، در دو پردہ شور پرشش برانگیختہ بود
 و چشم براہ داشت کہ کے نویند و دریغ کہ ہیچگاہ نوشتند کہ رخس سنگیں (یعنی
 اسپ سنگیں کہ در اکبر آباد معروف است)، دعائے مرا بکدام ادا پذیرفت؟ و دریا
 بپاسخ سلام من بہ زبان موج چہ گفت؟“

نواب عبداللہ خان صدر الصدور میرٹھ برادر نواب محمد سعید خان
 مرحوم رئیس رامپور نے مرزا کو لکھا ہے کہ رئیس ممدوح کی شان میں قصیدہ
 لکھو۔ مگر اس زمانے میں مرزا پریشان بہت ہیں۔ اس لیے ان کے جواب
 میں لکھتے ہیں:

”خدام بلند مقام کہ سرا بنجام قصیدہ از غالب بے نوا چشم داشتہ اند
 مگر آن فرسودہ روان افسردہ دل را کہ ہنوز نہ مرزہ است زندہ پنداشتہ اند
 گمان زیست بود بر کثرت زبیدی بدست مرگ دلی بدتر از گمان تو نیست
 کاش گشت یشیں کا۔ چوں صنعت نقاشی و گلہ ستہ بندی تنہا بکوشش
 دست و بازو صورت بستے، تا چشم از خستگی دل پوشیدے، و فرمان پذیرانہ

در پردازش کار کوشیدے۔ چہ کنم، چوں سہرایں رشتہ در دستِ دلست،
تا دل بر جاے نباشد، زبان سخن سراے نباشد۔ دیدہ و دانِ صاحبِ دل
داند کہ چہ قدر ہا دیدہ و دل بہم آمیختہ شود، تا نقشے، بداں شگرفی کہ
بالغِ نظراں پسندند، انگینتہ شود۔ ایں دل شکستہ بہم نہ پیوستہ کہ در سینہ
من و ہمان دشمن دیرینہ من ست، از نہار بکار سخن گستری نیاید و معنی
آفرینی را نشاید....“

قاضی عبدالجلیل بریلوی نے کچھ غزلیں اول ہی مرتبہ اصلاح کے
لیے بھیجی ہیں، اس کے جواب میں اصلاح کے متعلق لکھتے ہیں:

”خواہش مک و اصلاح مہر افزود۔ چندانکہ دیدہ بداں سواد دوختم،
نازیبا صورتے بنظر در نیامد۔ ہنجا و روش خود از نیرو ہاے درونی ست۔
آرے، نے عامہ در بنان ہر کس خراے دیگر دارد، آموزش را دریں
پردہ راہ نیست۔ و اگر گویند، ہست ہر آئینہ می توانم گنت کہ نیست، مگر
بہ ہمنشینی و ہمزبانی آموزگار، و بسر بردن روزگار در سترہ کردن گفتار۔
چوں صحبت صورت ندارد، و گفتم آمد کہ ہر چہ بہر نمط گفتم اند، نہ غلط گفتم
اند، می باید مقلد بر در دل زد و ہمت از مبداء قیاض در یوزہ کرد بکثرت
مشق، و فراوانی ورزش، و پیروی رہروان راہ دان کشاکشہا روے
خواہد نمود، داندیشہ را دستگاہ و گفتار را سرمایہ خواہد افزود“

مولانا فضل حق مرحوم کو ایک خط میں خط نہ بھیجنے کی شکایت لکھی
ہے اور ایک قصیدہ جو حمد میں عرفی کے رب سے پہلے قصیدے پر
لکھا ہے، خط کے ساتھ بھیجا ہے اور اس کی داد چاہی ہے۔ وہ خط بجنہ
لکھا جاتا ہے:

سبحان اللہ! باآنکہ از فراموش گشتگانم، دانم کہ دوست مرا بہ دو جو بلکہ بہ نیم
خس برنگیرد۔ ہر گاہ بساز داون آہنگ گلہ رُوے آرم، و سنجم کہ ایں پردہ
(یعنی نغمہ) را بے پردہ (یعنی بے تکلف) می توانم سرود، و از قہرمان
اندیشہ روربا شے (یعنی امتناع) در میان نیست۔ ہر آئینہ بدیں شادمانی
کہ ہنوزم با دوست رُوے سخن ہست، آ پنہاں برخویشتن می بالم کہ غم جانگداز
فراموشی فراموش، و لب از زمزمہ کہ دل در بند سرودن آنست (یعنی شکایت
خاموش می گردد)۔

از خویشتن بذوق جفا با تو ساقیم با ما دگر مساز کہ ما با تو ساقیم
دریں روز ہا ہواے آں در سراقاد کہ بیتے چند در توحید مجیداً عرفی گفتہ آید۔
چوں کوشش اندیشہ بجائے رسید کہ نہ عرفی را محل ماند و نہ مراجعے ناگزیر
آں ابیات را برکے عرض میدارم کہ چوں من صد و چوں عرفی صد ہزار را بسخن
پرورش تواند کرد، و پایا ہر یک بہر یک تواند نمود۔ والسلام“

یہاں تک ہم نے مرزا کے مکاتبات میں سے جو بجائے خود ایک دقتِ
طویل الذیل ہے، کسی قدر صاف اور سلیس عبارتیں انتخاب کر کے لکھی ہیں۔
اگرچہ اس قسم کی اور بہت سی عبارتیں اور خطوط مرزا کے مکاتبات میں
سے انتخاب ہو سکتے ہیں، مگر کتاب کا حجم بہت بڑھ گیا ہے، اس لیے
ہم اسی قدر قلیل پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس انتخاب کے بعد ہم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کی دلچسپی
کے لیے ان مشہور اُستادوں اور نثاروں میں سے جن سے ہندوستان کے
لوگ بخوبی واقف ہیں، چند شخصوں کی نثر کا مقابلہ مرزا کی نثر سے اس طرح
کیا جائے کہ جو عبارتیں مرزا اور دیگر اشخاص کی نثروں میں متحد المضمون پائی

جائیں، ان کو ایک دوسرے کے محاذی لکھ دیا جائے اور اس بات کا اندازہ کرنا کہ کونسا مضمون کس پائے کا ہے اور کون سا کس درجے کا، ناظرین کے ذوق و وجدان پر چھوڑ دیا جائے۔

سب سے پہلے ہم دو متحد المضمون مقام سہ نثر اور مہر نیمروز سے نقل کرتے ہیں۔ ظہوری نے دوسری نثر میں ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور کی نو صفتیں الگ الگ بیان کی ہیں، جن میں سب سے پہلے معرفت الہی کا ذکر کیا ہے اور شاعرانہ مبالغے کے ساتھ اپنے ممدوح کو اس صفت سے موصوف کیا ہے۔ مرزا نے مہر نیمروز کے دیباچے میں حمد و نعت کے بعد بہادر شاہ مرحوم کی مدح کے موقع پر اپنے شاعرانہ انداز میں ان کو بادشاہ اور درویشی کا جامع قرار دیا ہے اور مثل ظہوری کے نظم و نثر دونوں میں یہ مضمون ادا کیا ہے۔ ہم دونوں کتابوں سے وہ مقامات متقابل یکدگر نقل کرتے ہیں :

غالب

از انجا کہ بعد ہر دور طورے دیگر است و پس
از ہر انجام سرا نجاے جداگانہ در ہر عہد
عہد اسے دیگر است یعنی اسے دیگر از اسمائے
الہی اور ہر وقت وقت کشائش طلسمے دیگر
فرہ ایزدی (شان الہی) کہ چند را بنام آوری
شکوہ عز و غنا از سجاد رخسیدے، و اندے
را بہ نشاندہی فقر و فنا فروغ بخشیدے، منظرے

ظہوری

تا مدارِ لفظ و معنی بہ چشمت ثنائی
تارک آرنیست کہ سنی غلیل خود یعنی
ابراہیم عادل شاہ را در ہفت اقلیم بہ
صفت یگانہ و ممتاز گردانیدہ۔ اول
معرفت کہ با وجود مجب کثرت در شاہد
شاہد و عدت معنی کلام معجز نظام
”لو کشف الغطاء لما از دوت یقیناً“

وصف حال اوساخته، گلستان
 نیت و بوستان عقیدتش از خس و
 غاشاک شک و شبہ پر داغہ مجموعہ
 عرفان موقداں فردے از دفتر
 شناسائیش عتف و اشلیم ماسوے
 پسندیدہ طبع مواسائیس بہ توضیح
 بیانش نشانہاے بے نشان (یعنی
 ذات بے نشان) ہمہ دلنشین و
 خاطر نشان۔ بہ آفتاب جہاں گرد
 تاکید نظر بر دو بیان نینداختن
 و بہ معور قضا تہدید باحوال حوالا
 نیرداختن ز تار را بہ سجہ پیوندیت
 کہ گیتش برکشاکش کشیشاں
 (یعنی قسیساں) نہ خندہ و کفر را
 با ایماں نہ سربست کہ صداعش
 صندل چارہ از پیشانی برہناں
 نبرد۔ از صدمہ تو حیدش دول
 در یکی گرہختہ، و بہ علافہ تجربیش
 خودی و تویی آویختہ گوشے
 حق شنو، چشمے حق بین، دے
 حق جو، خاطرے عرفان زاسینہ

کالی و مآتے روشن خواست تا در اں
 منظر ظہور بہر دو رنگ، و در اں مآت رؤیت
 بہر دو صورت، یکبارہ رودہد۔ اورنگ و
 منبریکے شد و ستادہ و ستادہ را دولی از
 میان رفت۔ درفش کاویانی اکہ نشان
 بادشاہی است، از عصا و ردا کہ ہر دو
 شعار درویشاں و ہر دو در درفش جمع آمدہ
 منت پذیرفت کہ پیدائی من بہ پیوند این
 دو جزو باز بستہ است، و عصا و ردا درفش را
 سپاس گفت کہ دریں صفحہ (یعنی در درفش)
 نقش جمیعت ماسا نشستہ است۔ یکدگر
 خوردن این دو قدح (یعنی فقر و سلطنت)
 مجمع البحرینے پدید آورد، و سزہم آوردن
 این دو قوس نقش را زہ پدیدار کرد۔ از سرچش
 فروغ بہر دو ماہ با فشرین و پالودن و شستن پکیے
 ساختہ و بہر دفع گزند چشم بد از پروین و پرن
 براں پکیے پسند سوختہ سرش را بتاج شاہی
 افزاختہ و دلش را بنور الہی افزوختہ... زہے
 در انجمن خاوت نشین و بہ پادشاہی کاراگہی

معرفت خیر، تار کے آسماں سا، جہہ
سجدہ ریز

گزیں۔ پادشاہاں در انجمن ازاں کار آگاہ
ادب آموختہ، و کار آگاہاں در غلوت ازاں
پادشاہ فیض اندوختہ۔

ظہوری مثنوی

پاے رفعت بر آسماں دارد
سر خدمت بر آستان دارد
در عبادت بہ گفتن و دیدن
طرز او طرز حق پرستیدن
غلوت دیگران و صحبت او
و حدت این دآن و کثرت او
در دلش این و آن نمی گنجد
بیج جز حق در او نمی گنجد
بت شکن گشت چون غیل نخت
بادش ازانی اعتقاد درست
کفر در فکر نکتہ و عسرفاں
شرک در شکر نعمت ایماں

غالب مثنوی

اے کہ از راز نہاں آگہ نہ
دم مزین از رہ کہ مردہ نہ
”در ہزاراں مردہ مردہ یکیت
آدمی بسیار، اما شہ یکیت“
و تو می پرسی کہ مرد راہ یکیت
جز سراج الدین بہادر شاہ یکیت
در طریقت نہ ہما سے رہرواں
در خلافت پیشوا سے خسرواں
آنکہ چوں از راز وحدت دم زند
دفتر کون و مرکاں برہم زند
آنکہ چوں دے نوا را سردہ
کے شود نخلے کہ شبلی بردہ

یہ مثنوی معنوی کا مشہور ہے، اسی نے مرزا نے بخر خوا لے کے یہاں لکھ دیا ہے اور بشر کے

لفظ نے نہایت لطف پیدا کر دیا ہے۔

شبلی، از منبر دہد آواز عشق
شاہ ماہ بر تخت گوید، راز عشق
عشق دارد پایہ ہر کس نگاہ
منبر از شبلی و تخت از پادشاہ
آنچہ ابراہیم ادہم یافتست
بعد ترک مسند جم یافتست
شاہ ماہ دارد ہم در ہر وی
خرقہ پیری و تاج خسروی
شاہی و درویشی اینجا با ہم ست
پادشاہ عہد قطب عالم ست

طینتش باج خواہ طینت ہا
نیتش پادشاہ نیت ہا
در عبادت زہے تو مندی!
بندگی در خور خداوندی
برودت بغزبرد از پوست
ہمرا کرد خویش را ہمراست

شیخ علی حزیں اور مرزا کے طرز بیان کا مقابلہ

شیخ نے جو اپنے دیوان کا دیا چکھا ہے، اس میں وہ فخر پر فقرے
جو اس نے اپنے دیوان اور اپنے کلام کی شان میں لکھے ہیں، اسی قسم کے
فقرے مرزا نے بھی دیوان فارسی کے دیا چے میں انشا کیے ہیں۔ سو دونوں
دیا چوں میں سے ہم ملتے ملتے فقرے انتخاب کر کے اس مقام پر ہم مقابل
یکدگر لکھتے ہیں:

غالب

بنام ایزد نخستین نقابست از روے
شاہد ہر ہفت کردہ معنی بجنبتش نسیم
بر افتادہ یعنی کشاکش و سنت ناکشیدہ۔

حزیں

ہمایوں خطہ ایست لبالب از جواہر
کلم و جوائع حکم۔ روت پرور ہوایش
ربحی اعتدال و صباول سطورش ازماہ

معین مالا مال، خاکش مشکیں نفس
 و شیش عنبر آگیں، آبش خمار
 شکن و نسیمش مسیح آئین، از
 صبو حی فیضی کہ ساقی کلکشر
 پیمودہ، سیاہ مستانِ حرومت
 سردکنار ہم غنودہ اند، وازنشہ
 ہوش پروازے کہ دست
 نکرت در جام و سبوی الفاظ
 ریختہ، خردستان معنی نشید
 شوق سرودہ۔ بنام ایزد حسن لیلی
 ست کہ طرف خیام الفاظ سربر
 زودہ در جلوہ گری ست، یا شور
 مجنونے ست کہ از وادی تفسیدہ
 دل بر فاستہ در پردہ در لیت
 یوسفستانے ست از بگل پیران
 در موج نگارستانے ست
 سیمیں بدناش فوج در فوج،
 سہی پیکراتند در خیایان سطور
 دوشادوش، مغان شیوہ دلیرانند
 از بادہ ناز گرم نوشا نوشش،
 نازک بدنانند حجاب پروردگار

باز پس چرخ نیست از گرمی چراغان
 نیم سوختہ پہلو رخ بہ افروختن دارد،
 یعنی داغ منتِ خس نادیدہ کہن داغ
 جنون ست ہر سر بہ ناخن شوخی نفس
 خراشیدہ۔ گرما گرم خونابہ در دست بہ
 تفت پنهانی دل ناگہ از ناسور تراویدہ۔
 کاغذی پیر نہانند (یعنی داغواپانند)
 چوں پیکر تصویر از حیرت واقع خاموش
 (یعنی اپنی بقعدی سے حیران ہیں) شعل
 بکف گرفتگانند (یعنی فریاد یاںند) چوں
 آذر از دودِ دل سیر پوش..... نگویم
 دود و چراغست بالالہ و داغ، اما
 سوختگی را سرگزشت ست و خستگی را
 رویداد۔ نگویم تجلی و طور است یا جنت
 حور، اتانازش را قلمرو ست و
 آرامش را سواد (نواح) طلسم شعلہ و

سہ الفاظ کو اس لیے کہ وہ کاغذ پر قوم ہیں،
 کاغذی پیر بہن کہا ہے اور کاغذی پیر بہن را طواہ کو
 کہتے ہیں۔ دوسرے فقرے میں معانی کو اس لیے کہ ان کی
 روشنی حرور کی سیاہی میں پوشیدہ ہے شعل بکف اور سیر پوش کہا

پیر ہناتہ تنہا گرد، پختہ مغزاندہ برشتہ
 پوست، بیگانہ نغزاندہ آشادوست
 صوفیانتہ در وحدت خانہ عشق
 مست سماع، سوختگانہ سپند
 آسا سرگرم و ناع، درویشانہ
 تجرد کیش، فرو کیشانہ از ہمہ
 در پیش، شیر صولتانہ از جوشن
 خط پلنگینہ پوشش، دیار لانہ از
 شورش عشق در جوش و خروش
 آئینہ پیکراندہ آئینہ تاب، پاکیز
 گوہراندہ یکسر خوشاب، گلبرگ ہلے
 شبنم زدہ بہاریت خراشیدہ مالہا
 بلبل شاخساریت۔

دودست، باز بستہ زردشت خیال
 شعلہ پنہاں، دود پیدا، دل لوح
 طلم وزبان طلسم کشا، ہنگامہ ابرو
 بارست برانگینہ جادوے فکر
 ابر گہر باش و بار الماس فشان
 اندیشہ طومار نیرنگ و لب افسون
 خوان درود کہا بیت باندا ز پیچ و
 تاجے کہ از شعلہ در دل افتادہ ست
 بر ہوا تنق بستہ خیل غزالے ست
 بسا مان جنبشے کہ در کبین گاہ رودادہ
 است۔ از دام بذر حبستہ جہلیست در پردہ
 نمایش خویش مشاطہ حقیقی استایش
 نگار۔ نہالے ست در سایہ برو مندی
 خویش نخل بند ازل را سپاس گزار۔

مرزا اور ابوالفضل کی طرز بیان کا مقابلہ

مرزا نے مہر نیمروز میں اکثر تاریخی واقعات وہی لکھے ہیں، جو شیخ
 کے اکبرنامہ میں مذکور ہیں، مگر چونکہ مرزا نے ان واقعات کو کسی قدر کمی
 بیشی اور تقدیم و تاخیر کے ساتھ اپنی خاص طرز میں لکھا ہے، اس لیے
 دونوں کتابوں کی طرز بیان میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ ہم یہاں ایک
 سیدھا سادا واقعہ دونوں کتابوں سے نقل کرتے ہیں:

اکبرنامه

ترک بزرگترین فرزندان یافت بود.
 ترکان او را یافت او غلان گویند؛
 و بهوشیار ولی و کارگزاری در عیت پروری
 از همه برادران امتیاز داشت. بعد از
 رحلت پدر بر تخت فرمانروائی نشست؛
 و داد مردمی و درانگی و مظلوم پرستی
 داد. و در جای که ترکان او را
 اسلول با سلیکائی میگفتند و چشمه‌ها
 آب سرد خوشگوار و گرم عافیت بخش
 و مرغزارهای دلکش داشت، اقامت
 فرموده. از چوب و گیاه خانه با اختراع
 کرده و خرگاه پدید آورد و از پوست
 بهائم و سباع لباس پوشیدنی دوخت؛
 و نمک در دامن او ظاهر شد. و در آیین
 آوان بود که پسر را مجز شمشیر
 میراث ندهند و تمام خواسته رخترا باشد
 و گویند او معا صبر کیومرث اول ملوک
 عجم است، و او اول سلاطین ترکستان
 است و عمر او دولیت و چهل سال بود
 آنچه خان بهترین فرزندان ترکی بود.

مهرنمروز

ترک ابن یافت نشان جهان داری
 یافت و ترکان این والا شکوه را؛
 ازاں رو که به ترکی شهریار جوان را
 او غلان گویند یافت او غلان گفتند.
 دار و دانش آیین داشت، و درین
 هر دو شیوه روشهای گزی داشت.
 خانی و مرزبانی را فرنگ آمد پدید
 آورد، و فرماندهی و فرمانبری را اندازه
 بر نهاد و زنگاه سلول با سلیقا
 را که چشمه‌های روان و گل و میوه فراوان
 داشت، از بهر آرامش گزید از نعل و
 علف و چوب و گیاه نشین با افراخته؛
 و پوست دام و دود را پوشش تن ساخت.
 گویند نمک به روزگار و س پدید آمد،
 ورنه ازاں پیش تره و گوشت، همچنان
 بے نمک همی خوردند. ترکان شمشیر زن
 را بفرمان فرزان شمشیر افکن (یعنی
 یافت او غلان) بر نهاد (دستور) و قرار داد
 آن بود که ازاں همه برگ و ساز که از مرده
 مروری (میراث) بازماند مجز شمشیر به پسر

اکبر نامہ

چوں پیام از زندگی ترکی
 پر شدن گرفت، او را
 بمشورہ بزرگان بر تخت
 سلطنت نشانده، او خرد
 دور بین را پیشواے
 خود ساخت، در عدالت
 گسری روزگار گذرانده
 چوں پیر شد، عزلت
 اختیار فرمود، دیباچی
 بعد از عزلت پدر و
 اشارت عالیش فرماں روا
 شد کیوک خان،
 فرزند شیداوست پید
 در هنگام پدر و کردن
 جهان سر بر خانی باو
 عنایت فرمود، او قدر
 سلطنت را دانسته در
 لوازم آن اهتمام بجای
 آورد، انجہ خان پسر
 اوست در آخر عمر

مہر نیمروز

ندہند و ہمہ بدختر باز گزارند کہ ہر آئینہ تیغ جوہر دار فرد
 فہرست گنجینہ سیم وزر بلکہ کلید فتح ہفت کشور ست۔
 اگر بدیں پلارک الماس گوں دسترس ست، مرد را
 دست مایہ ناز بس ست۔ بالجلد ایں ہمہ رسم و آئین
 نہاد و پایان کار پس از دولست و چہل سالہ بیداری
 بخواب عدم سر بر زمین نہاد۔ بزرگان دودہ پس از
 یافت او غلام بہ فرزند بخت بلندش ایلچہ خان
 چشم روشنی گفتند۔ کلا کج نہاد و راستی پیشہ گزید۔ بدی
 پیرامون دیش نگذشتے، و بایداں ہمزباں نگشتے۔
 آناہ رو بود، و دل بیاد یزداں در گردداشت۔
 تاج و تیغ و نگین در زندگانی خویش، بہ نو بارہ بار غ
 کارانی خویش دیباچی خان جوان بخت نوجوان سپرد
 و خود ازیں خازنار دامن بر چید، و بہ آفریں خانہ کہ
 تو آن را صومعہ گوی، آرمیدہ دودہ تیغ سال پارہ، نموداری اقبال پارہ
 پرستاری ذوالجلال در جهان گذراں ماند، و بہنگام
 ناگزیر در گذشت۔ دیباچی خان کہ ہم در نظر گاہ پدر
 اورنگ آراے بود، اورنگ خسروی را بر منطے تازہ
 آراست، اما بدیں دانشوری و دادگری کہ مجز دانش
 نہ جست و مجز داد نہ کرد۔ روزنامہ عمرش چوں رقم
 یک صد و ہشتاد و شش سالگی پذیرفت، در نوشتند،

اکبر نامہ

پید و لیچہ شد۔ رادو
 دہش! از اندازہ بیرو
 بُرد۔ و ترکان دزدان
 دولت اوست دولت
 شد از راه خردندی
 عدول نمودند و چون
 مدتی بران گزشت
 او را دو سپہ یک شکم
 آمد یکے را مغل نام
 کرد و دیگرے را تاتار۔
 و چون بحد کاروانی رسیدند
 ملک خود را بہ دو
 حصہ بخش کرد، یک نصف
 را بہ مغل داد و نصف
 دیگر را بہ تاتار و چون بدر
 بزرگوار ایشان ودعت
 حیات سپرد، فرزندان
 با یکدیگر موافقت نمودند
 ہر کدام در ولایت خویش
 خود را نی میگردند۔

مہر نیمروز

و بار نامہ کجکلی و گردن گشی بنام پسر فرخ اخترش
 کیوک خان نوشتند۔ ستودہ ستایش در خور بکار
 آگاہی آبروے پادشاهی افزود۔ و یک صد و چہل سال
 از مرگ اماں یافت۔ فرزند تا از شاہی نشان یافت
 جہان را بخوشی و خوشنودی و جہانیاں را بہ مہر و آرم
 نگاہداشت و سرانجام کار جہان و جہانیاں را بفرزید
 خویش النجہ خان گذاشت۔ بہ تریستی دریا کفت، و
 بہ بیدریغ بخشی ایر کردار بود۔ دہش را بر دادیشی داد۔
 و فرودستان (ذیردستان) را بہ دہش از خواہش
 بے نیاز ساخت۔ سبکسراں بہ بادبردت (یعنی بہ کبر و غرور)
 از جاہ افتند۔ و از دائرہ کیش و آئین بدزدند۔ آرامش
 (یعنی انتظام) کنار گرفت و بت پرستی صورت پذیرفت۔ بانو
 این فراں واسے باریک نوادہ پسر توام زاد۔ اورنگ نشین
 (یعنی النجہ خان) یکے را مغل خان دیگرے را تاتار خان نام
 نہاد۔ ہر دو را بنام پرورد۔ چون بہ بزرگائی رسیدند علم و خویش
 را دو نیم کرد۔ نیمہ مغل و نیمہ تاتار نامزد کرد و خود یکصد و بہشت وقت
 سال در گیتی درنگ در زد۔ بے رفتگان بزرگوار شد۔
 این را نیز چون روز فرود رفتگان در روز فرو رفت۔
 ریزد آں برگ و این گل افشاند
 ہم خزان ہم بہار در گز راست

خاتمہ

مرزا غالب مرحوم کی الائف اور ان کے کلام کا انتخاب جس قدر کہ یہاں اس کا رکھنا مقصود تھا، ختم ہو گیا، مگر ابھی چند ضروری باتیں لکھنی باقی ہیں۔

ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ کتاب ان تصنیفات میں شمار نہیں ہو سکتی، جن کی آج کل ملک میں ضرورت سمجھی جاتی ہے اور جو اہل وطن کی موسمی بیماریوں کے لیے براہ راست دوا اور علاج کا کام دے سکتی ہیں کیوں کہ اس مضمون کے لکھنے پر ہم کو اس اندھی اور بھری دیوئی نے مجبور کیا ہے، جس کی زبردستی اور حکومت کے آگے مصالحت اندیشی کے پر جلتے ہیں۔

مستانہ سخن می رسد از دل بلب لباب عشق مست کہ بر لبہ زبان ادبیا
 راقم کو مرزا کے کلام کے ساتھ جو تعلق بدو شعور سے آج تک برابر چلا آتا ہے، اس کو چاہو، اس معتقدانہ جوش عصیت کا نتیجہ سمجھو جو انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتا ہے۔ اور چاہو، اس یقین کا ثمرہ خیال کرو، جو نہایت زبردست شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے۔ بہر تقدیر یہی وہ چیز تھی جس نے ہم کو اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ پس نہ ہم کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے اس تالیف سے ہلاک کی کسی بڑی ضرورت کو رفع کیا ہے، اور نہ یہ خیال ہے کہ محض ملک کی خیر خواہی اس کے لکھنے کا باعث ہوئی ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ جو کام محض طبیعت کے اقتضا سے، نہ کہ عطف کی عواہد سے سرانجام کیا جائے، اس سے لوگوں کو بواسطہ یا بلا واسطہ کسی طرح کچھ فائدہ نہ پہنچے۔ ہوا جو اپنی موج میں چلتی ہے اور دریا جو اپنے جوش میں بہتا

ہے، گو اُن کو خود یہ خبر نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی سعی محض بے حاصل اور ان کی کوشش سراسر بیسود ہے۔ اسی طرح کوئی ذرہ ذراتِ عالم میں ایسا نہیں جو اپنی اضطرابی حرکت سے نظامِ کُلّی میں کچھ نہ کچھ دخل نہ رکھتا ہو۔

اسے کہ تو ایچ ذرہ راجز بر و تور وے نیست در طلبت تو ان گرفت، بادیہ را بہ رہبری یادگار غالب کو ہم نے دو حصّوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصّے میں مرزا کی لائف یعنی ان کی زندگی کے حالات اور اُن کے اخلاق و عادات کا بیان ہے، اور دوسرے حصّے میں ان کے کلام کا انتخاب۔ اگرچہ مرزا کی لائف میں، جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں، کوئی بہتم باشان واقعہ ان کی شاعری و انشا پردازی کے سوا نہیں پایا جاتا، با ایں ہمہ اس میں بہت سی مفید نصیحتیں بھی اہل وطن کے لیے موجود ہیں۔

ناظرین کو یاد ہو گا کہ مرزا پانچ برس کے تھے جب باپ کا اور نو برس کے تھے، جب چچا کا انتقال ہوا۔ ان کی ننھیاں جہاں انھوں نے پرورش اور نشوونما پائی، سودہ مال تھی۔ باپ اور چچا کے صغیر سن چھوڑ جانے سے نانا اور نانی کی الفت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہوگی۔ خود مرزا کی طبیعت میں گرمی اور جورت کی ایک آگ بھری تھی جس کے بھرکانے کے لیے تھوڑی سی اشتعالک کافی تھی۔ باپ اور چچا کا سایہ تربیت بچپن میں سر سے اٹھ جانا، ننھیاں کی مرفہ الحال، نانا نانی کی ناز برداریاں، اور خود مرزا کا ذکی المحس ہونا، یہ تمام اسباب ایسے تھے کہ عنفوانِ شباب میں ان کا مادہٴ استفیم سے تجاوز نہ کرنا نہایت دشوار تھا۔ مرزا کی ابتدا بگڑی اور ایسی بگڑی کہ جب تک ننھیاں کی تمام الماک اور دیہات کی صفائی نہ ہوئی، نشے ہرن نہ ہوئے۔ اگرچہ مرزا بہت دیر

میں سنبھلے، مگر وہ جو مشہور ہے کہ ”صبح کا بھولا شام کو آہائے، تو بھولا نہ جانو“ انھوں نے اپنے فضل و کمال، حسن معاشرت، شریفانہ خصائل اور کریمانہ اخلاق سے جو کہ ان کے ذاتی جوہر تھے، وہ عارضی دھبے اس طرح دھو ڈالے کہ گویا کبھی ان سے دامن آلودہ نہ ہوا تھا۔ جس فن پر انھوں نے لڑکپن میں ہاتھ ڈالا تھا، اس کو اخیر عمر تک نبھا دیا؛ غفلت اور بدمستی کے عالم میں بھی اس کا خیال نہ چھوڑا؛ اور باوجود اس کے زمانہ قدر دانوں سے خالی تھا، اُس کو اُس درجے تک پہنچا کر چھوڑا جو اس کا منتہا ہے کمال تھا۔

اگرچہ معاشرے کی طرف سے وہ کبھی زیادہ تنگ نہیں ہوئے مگر حوصلہ اور ہمت کے موافق کبھی استطاعت نصیب نہیں ہوئی، بلکہ جن اعلیٰ تلوں میں بچپن اور جوانی گزری تھی، اُس کے لحاظ سے یہ کہنا چاہیے کہ وہ اخیر دم تک خور بعد الکور میں مبتلا رہے۔ اس کے سوا اراضِ جسمانی سے کبھی فرصت نہیں ملی اور اپنے ہنر کی کساد بازاری کا رنج ہمیشہ سواہن روح رہا۔ باوجود اس کے زندہ دلی اور شگفتہ طبعی مرتے دم تک ان کی رانیق حال رہی۔ اگرچہ نظم و نثر میں جوازِ نایاں انھوں نے کی ہیں، وہ بظاہر بیصبری اور تنگ حوصلگی پر، جو ایک اخلاقی کمزوری ہے، دلالت کرتی ہیں، لیکن درحقیقت یہ ان کی شاعری و انشا پر دازی کے میدانوں میں سے ایک میدان تھا، جس کی زمین ان کے پاؤں کو تنگ گئی تھی۔ اول تو خور و مضین ہی ایشیائی شاعری کا جزو اعظم ہے؛ دوسرے ہر شاعر ایک خاص رائی کی کلاؤت ہوتا ہے۔ چنانچہ عرب کے شعراء میں امرؤ القیس گھوڑے اور عورت کی تعریف اور عیش کے بیان میں مشہور تھا۔ اعشیٰ حسن سب اور وصفِ شراب میں ضرب المثل تھا؛ اور اسی طرح ہر شاعر کی

شہرت کسی خاص بیان کے ساتھ مخصوص تھی۔ علیٰ ہذا القیاس ایران میں فردوسی رزم کا دھنی تھا، نظامی رزم کا، اور سعدی موعظت کا۔ چوں کہ مرزا خاص کر رنج و مصیبت کے بیان میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، اس لیے یہ مضمون اکثر ان کے قلم سے تراوش کرتا تھا۔

اگرچہ مرزا اپنی شاعری کا سکہ اس وجہ سے کہ زمانہ اُس کے اندازہ کرنے سے عاجز تھا، پہلک کے دلوں پر جیسا کہ چاہیے تھا، نہیں بٹھا سکے، مگر وسعتِ اخلاق، حسنِ معاشرت، اور صلاحِ کل سے انھوں نے ایک عالم کو مسخر کر دیا تھا۔ قطع نظر شاگردوں اور مستفیدوں کے، دوستوں اور خواہوں کی تعداد بھی سیکڑوں سے گذر کر ہزاروں تک پہنچ گئی تھی؛ اور ہر ایک کے ساتھ ان کے برتاؤ کا طریقہ ایسا ہر انگیز تھا کہ ہر شخص اپنے تئیں ان کے مخصوص ترین دوستوں میں سے شمار کرتا تھا۔ غریبوں اور محتاجوں کی اپنی دسترس سے بڑھ کر خبر لینی، نوکروں اور گئے بندھوں کو عسرت کے وقت اپنے سے علیحدہ نہ کرنا، در ماندگی میں دوستوں کی امداد کرنی، اور ان کی مصیبت پر مثل یگانوں کے افسوس اور ان کے ساتھ ہمدردی کرنا، ہر حال میں پاس وضع اور خودداری کو ہاتھ سے نہ دینا، مذہبی تعصبات سے پاک ہونا اور ہر مذہب و ملت کے دوستوں کے ساتھ یکساں صفائی اور خلوص سے ملنا، یہ اور اسی قسم کی وہ تمام خوبیاں جو دار الخلافہ کی قدیم سوسائٹی کا زیور سمجھی جاتی تھیں، اُن کی ذات میں جمع تھیں، خصوصاً وفاداری، حق شناسی، اور احسان مندی کی شریف خصلت جو ہندوستان کے قدیم فاندالوں کا شعار تھا، مرزا کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ چوں کہ ان کے چچا نصر اللہ بیگ فلن لارڈ لیک کی بہات میں شریک رہے تھے، اور ان کی وفات کے بعد گورنمنٹ

نے ان کے پسماندوں کے لیے، جن میں سے ایک مرزا بھی تھے، کئی ہزار روپیہ سالانہ بطور پنشن کے مقرر کر دیا تھا، مرزا نے جیسا کہ ان کی تحریرات سے ظاہر ہے، اخیر عمر تک گورنمنٹ کے اس احسان کو فراموش نہیں کیا، بلکہ تمام عمر ملک معطر اور ویسراؤں اور لفٹنٹ گورنروں اور دیگر حاکموں اور افسروں اور تمام انگلش قوم کی مدح سرائی میں بسر کی، بعض افسروں کی وفات پر دودناک مرثیے لکھے، اور ہمیشہ فخر کے ساتھ اپنے تئیں وابستگانِ دامنِ دولت انگلشیہ سے سمجھتے رہے۔ غدر کے زمانے میں فوج باغی کے ظلم و ستم سے جو اثر ان کے دل پر ہوا تھا، وہ ان کی کتاب و تنبیہ سے جو غدر کے حالات پر اسی شورش و فتنہ کے زمانے میں انھوں نے لکھی تھی، ظاہر ہے۔ ۱۲۵۲ھ میں ولیم فریئر صاحب ریزیڈنٹ و کمشنر دہلی کے بے گناہ مارے جانے پر جو سخت صدمہ ان کو پہنچا تھا، وہ ان کے اس خط سے جو شیخ امام بخش ناسخ کو اس واقعہ کے ہونے ہی انھوں نے لکھا تھا، ظاہر ہے۔ وہ اس خط میں لکھتے ہیں:

یکے از سنگدانِ ناخدا ترس کہ بعد از ابدی گرفتار باز ولیم فریئر را کہ
 ریزیڈنٹ دہلی و غالب مغلوب را مرقی بود، در شب تاریک بضر بآفتک
 کشت، و مرا غم مرگ پدر تازہ کرد۔ دل از جاے رفت، دسترگ اندو ہے
 سراپاے اندیشہ! از درگت، خرمین آرا میدگی پاک بسوخت و نقشِ امید
 از صفو، خمیر مرا سرستردہ شد۔

اگرچہ مرزا کے کلام میں مدحیہ قصائد کی مقدار تمام اصنافِ سخن سے زیادہ معلوم ہوتی ہے اور انھوں نے جا بجا اس بات پر افسوس کیا ہے کہ عمر کا بہت بڑا حصہ اہل جاہ کی بھٹی میں صرف ہوا، مگر ادنیٰ تاہل

سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جو فن مرزا نے اختیار کیا تھا، اس کی تکمیل ان کے زمانے کے خیالات کے موافق زیادہ تر اس خاص صنف یعنی قصیدے کی مشق و مہارت پر موقوف تھی کیوں کہ فارسی شاعری کی ابتدا اسی صنف سے ہوئی۔ اور کول شاعر جس نے قصیدے میں کمال بہم نہیں پہنچایا، وہ مسلم الثبوت نہیں سمجھا گیا یہاں تک کہ حکیم سنائی، شیخ سعدی اور امیر خسرو جیسے بزرگوں کا دامن بھی اس آلودگی سے پاک نہیں رہا۔ خود مرزا کا قول تھا کہ جو قصیدہ نہیں لکھ سکتا، اس کو شعرا میں شمار کرنا نہیں چاہیے، اور اسی بنا پر وہ شیخ ابراہیم ذوق کو پورا شاعر اور شاہ نصیر کو ادھورا جانتے تھے۔ بڑی دلیل اس بات کی کہ مرزا نے جس قدر قصیدے اہل دنیا کی مدح میں انشا کیے ہیں، ان سے محض فن کی تکمیل مقصود تھی، یہ ہے کہ ان کا ممدوح مخاطب صحیح ہو یا نہ ہو، اور اس سے حسن کلام کی دار ملنے کی توقع ہو یا نہ ہو، وہ ہمیشہ قصیدوں کے سرانجام کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کرتے تھے اور ہر قصیدے میں اپنا کمال شاعری اسی طرح ظاہر کرتے تھے، جیسے مستبکی، سیف الدولہ کی یا عرفی، خانخاناں کی تعریف میں کرتا تھا۔ مع ذلک چند قصیدوں کے سوا جو دوستوں کی ترغیب و تحریص سے انھوں نے کسی اتید یا توقع پر ہندوستان کے بعض رئیس کی مدح میں لکھے ہیں، باقی ان کے تمام قصائد یا توحید و نعت و منقبت میں ہیں، یا اپنے معزز اور لائق محضروں کی تعریف میں اور یا ان لوگوں کی شان میں جن کو وہ اپنا مرئی اور ولی نعمت سمجھتے تھے اور جن کی مدح نرائی کا فرض بطور شکرگزاری و منعم پرستی نہ بامید صلہ و انعام ادا کرتے تھے، جیسے قلعہ دہلی کے بادشاہ و ولیعہد، یا ملکہ معظمہ اور

ویسرایان کشور ہند، اور دیگر اعیان و ارکان سلطنت انکھشیر یا فرما نروایان ریت
رامپور و الور و غیرہ۔

باایں ہمہ جس موثر طریقے سے مرزا نے اہل دنیا کی مدد سرائی
پر افسوس کیا ہے وہ ملاحظہ کے قابل ہے۔ وہ دیوان فارسی کے
دیباچے میں اپنی شاعری کے متعلق بہت سے مخبرہ فقرے لکھنے کے بعد لکھتے ہیں:

در ہوانے کہ بال بالا خوانی زہ و درارے کہ خود را بہ شکر فی سنوہ ام دینی

جس دیوان پر میں نے اس تہ فز کیا ہے (نیز ازاں شاہ بازی ست۔

یعنی ہوا پرستی اس سے مراد غزل سرائی ہے) و نیز دیگر نوگرستانی ست۔

یعنی باد خوانی (اس سے مراد قصیدہ گوئی ہے)۔ بیداد میں کہ ہر جا بشارت

خے از زلف مرغور مویاں کشورہ شود بلاد من آویزد تا دل بہ پیچاکب آں

سکن بندے : و خواری حکم کہ بہ عملہ از خود فائل و از خدا فارغ بلونگ

سروری کج نشیند، ہوس را برا نگیزد، تا بہ پیشش بندہ وارستہ ستے۔

نادم از آذادی کہ ب سخن بہنجاہر عشقا زان گزار دستم، و را غم از آذری

کہ در تے چند بکریار دنیا طلباں در مدح اہل جاہ سیاہ کردستم۔ در یغا کہ

مرہبک سر لختے بہ چارہ و چنگ سر آمد و بارہ بہ دروغ و دروغ رت۔

یہاں تک جو کچھ کہ مرزا کی لائف کے متعلق ہم کو لکھنا تھا، لکھا گیا۔ اب

ہم چند ستر میں ان کے کلام کے انتخاب کی نسبت لکھنی چاہتے ہیں۔

ہم نے اس کتاب میں، جیسا کہ مکرر بیان ہو چکا ہے، مرزا کے کلام

کا انتخاب صرف اس غرض سے کیج کیا ہے کہ شاعری و انشا پردازی کی غیر مہر

استعداد جو مرزا کی فطرت میں رکھی گئی تھی، جہاں تک کہ ان کی نظم و نثر

اس بہ نہایت دے سکتی ہے، صاحبان ذوق سیم بہ واضح و لائحہ ہو جانے

اگرچہ فی الحقیقتہ طریقہ مذکور سے اس غرض کا پورا ہونا نہایت دشوار ہے۔ لیکن بالغرض اس کا پورا ہونا تسلیم کر لیا جائے، تو بھی بظاہر اس سے کوئی فائدہ متصور نہیں۔

زمانہ حال کی ترقیات نے جس طرح علمی دنیا میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے، اسی طرح لٹریچر کی حالت بہت کچھ بدل ڈالی ہے۔ قدیم طریقہ کی شاعری اگرچہ ابھی تک اس کا نعم البدل پیدا نہیں ہوا، روز بروز نظروں سے گرتی جاتی ہے۔ نظم و نثر میں بجائے صنعتِ الفاظ اور محض خیالی باتوں کے سادگی اور حقیقت طرازی کی طرف طبیعتوں کا میلان زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ جو باتیں پہلے محاسنِ کلام میں داخل تھیں، اب ان میں سے اکثر داخلِ عیوب سمجھی جاتی ہیں۔ اگرچہ ہندوستان میں قدیم لٹریچر کا تسلط ابھی بہت کچھ باقی ہے، اور پبلک کا مذاق عام طور پر نہیں بدلا، مگر زمانے کا رخ قدیم شاہراہ سے یقیناً پھر گیا ہے اور آئندہ تمام قافلوں کو جو اس دادی میں قدم رکھنے والے ہیں، زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا ضرور ہے۔ پس اگر مرزا کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا شاعر فرض کر لیا جائے، تو بھی اس زمانے میں ان کی نظم و نثر کے نمونے پبلک کے سامنے پیش کرنے اور ان کے مبلغ کمال کو لوگوں سے معاشناس کرانا، بظاہر ایک ایسا کام معلوم ہوتا ہے، جس کا وقت گزر گیا۔ لیکن ہمارے نزدیک زمانہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے، اس کو قدیم نمونوں سے کبھی استغناء حاصل نہیں ہو سکتا، خصوصاً ہندوستان کی لٹریچر ترقی جس قدر مشرقی زبانوں کے قدیم لٹریچر سے وابستہ ہے، ایسی یورپ کی موجودہ لٹریچر سے نہیں ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کے بعض نامور شعرا مشرقی

شاعروں کے کلام سے اب تک استفادہ کرتے اور اس سے صدہا اسلوب بیان اخذ کرتے ہیں، تو ہمارے ہم وطن کیوں کر اس سے استغنا کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ جس طرح زمانہ حال کے انجیر قدیم عمارتوں اور پراسے کمنڈروں سے انجیرنگ کے متعلق صدہا مفید نتیجے استخراج کرتے ہیں، اسی طرح اس زمانے کے ناظم اور ناثر قدیم لٹریچر سے بہت کچھ لٹریچری فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم نے مانا کہ انگلش لٹریچر کی ترقی انتہائے کمال کو پہنچ گئی ہے، اور ہمارے لٹریچر نے اسی کی بدولت کچھ عرصے سے آگے قدم بڑھانا شروع کیا ہے، مگر جب تک لوگ یہ نہ سمجھیں گے کہ ہم کو انگلش لٹریچر سے کونسی باتیں اخذ کرنی چاہئیں اور اپنے قدیم مشرقی لٹریچر سے کیا سبق لینا چاہیے، اس دقت تک ہمارا لٹریچر اصلی ترقی سے محروم رہے گا۔

مرزا کے فارسی کلام کا نمونہ جو ہم نے اس کتاب میں دکھایا ہے، اگرچہ ممکن ہے کہ وہ زمانہ حال کے مذاق کے موافق نہ ہو، لیکن اس سے مرزا کے کمال شاعری میں کچھ فرق نہیں آتا۔ خود ایران کے بڑے بڑے نامور شعراء جو اپنے زمانے میں مسلم الثبوت تھے، آج اہل زبان ان کی طرز شاعری کو نام رکھتے ہیں، خصوصاً متوسطین کے طبقے میں جو لوگ جامی کے بعد ہوئے ہیں، اور جن میں تقریباً وہ تمام شعراء داخل ہیں جنہوں نے صفویہ اور مغلیہ کے عہد حکومت میں ایران یا ہندوستان میں کلم امتیاز بلند کیا تھا، ان کی شاعری کو ہمیشہ کہ رضا قلی خان ہدایت نے اپنے تذکرہ مجمع الفصحا میں تصریح کے ساتھ لکھا ہے، آج اہل زبان میں کوئی تسلیم نہیں کرتا، سب قدما کی روش کو پسند کرتے ہیں اور انھیں کی تصحیح کا دم بھرتے ہیں حالانکہ

متوسطین کے طبقے میں بڑے بڑے نامور شعرا گزرے ہیں، جن کے کمال اور استادی کا انکار نہیں ہو سکتا۔ پس درحقیقت کسی کی شاعری یا انشا پر دازی کا پسلیک کے وجود و مذاق کے خلاف ہونا، اس کے سوا کچھ معنی نہیں رکھتا کہ جو شے پہلے ایک خاص وضع کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی، وہ اب دوسری وضع کے سانچے میں نہیں سما سکتی۔

اگرچہ مرزا کی شاعری نے شعراے متوسطین کے محدود دائرے سے قدم باہر نہیں رکھا، وہی چند میدان جن میں انھوں نے اپنے گھوڑے دوڑائے تھے، ہمیشہ مرزا کے جولان گاہ رہے۔ لیکن جس درجے کا ملک شاعر کی ان کی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا، اس سے پایا جاتا ہے کہ جس طرح دریا سے موج بدھ رُخ کرتا ہے، اُدھر اپنا راستہ برابر نکالتا چلا جاتا ہے۔ اے طرح وہ جس میدان میں قدم رکھتے، اس کو کامیابی کے ساتھ طے کر

وہی بارود جو آتش بازی میں بچوں کا جی بھاتی ہے، جب اس کو دوسری طرح کام میں لایا جاتا ہے، تو بڑے بڑے قاعوں اور پہاڑوں کو پرکھ کی طرح اڑا دیتی ہے۔ اور وہی ایک چیز تھی، جس نے کہیں صرنا اجباب کے جلسوں اور امپروں کے درباروں کو گرم کیا اور کہیں ملکوں اور قوموں میں حب وطن اور قومی ہمدردی کی آگ لگا دی۔

اعلیٰ درجے کا ملکہ شاعری کسی خاص زمانہ یا خاص ملک کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتا، پس یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ شاعری کی اعلیٰ قابلیت جیسی قدما میں ہوتی تھی، ویسی متاخرین میں نہیں ہو سکتی؛ یا جیسی ایران کے شعرا میں ہوتی ہے، ویسی ہندوستان کے شعرا میں نہیں ہوتی۔ ملکہ شاعری کی مثال بعینہ ایسی ہے، جیسی معصوری کی قابلیت یا سریلی آواز۔

جس طرح ان دونوں صفتوں کا ہر زمانے اور ملک میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے پر پایا جانا ممکن ہے، اسی طرح اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا ملکہ شاعری ہر زمانے اور ہر ملک میں مختلف اسباب سے مختلف صورتوں اور مختلف شائلوں میں ظہور کرتا ہے، اور سب سے بڑا اور زبردست حاکم جو شاعر کو ایک خاص رنگ پر ڈال دیتا ہے، وہ سوسائٹی کا دباؤ اور اس کا مذاق ہے۔ انیس اسی ملکہ شاعری کے ساتھ جو اس کی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا، اگر چوتھی صدی ہجری میں ایران میں پیدا ہوتا، اور اسی سوسائٹی میں نشوونما پاتا، جس میں فردوسی نے نشوونما پائی تھی، تو ہمارے نزدیک اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ رزمیہ نظم میں وہی رتبہ پاتا جو فردوسی نے پایا تھا۔ اور فردوسی اسی اعلیٰ قابلیت کے ساتھ جو قدرت نے اس کے دماغ میں ورہیت کی تھی، اگر ہندوستان کی اس سوسائٹی کے سایہ میں پتا، جو انیس کو میسر آئی تھی تو یقیناً وہ شاعری میں وہی صنف اختیار کرتا، جو انیس نے اختیار کی تھی اور اس میں انیس سے کچھ زیادہ قبولیت حاصل نہ کرتا۔ اسی بنا پر ایران کا ایک متأخر شاعر کہتا ہے:

نبت اندر زمانہ محمود ہے در نہ ہر گوشہ صد چو عنصر لب

اور سی اصول پر غالب مرحوم کہتے ہیں:

تو اسے کہ جو سخن گستران پیشینی مباشر منکر غالب کہ در زمانہ نبت

مرزانے جس وقت شعر فارسی کے میدان میں قدم رکھا تھا، اس

دب ہندوستان میں دو طرزوں کا زیادہ رواج تھا: ایک نظیری و

عرفی و غیری کی طرز، جو اکبر کے زمانہ سے چلی آتی تھی؛ دوسری مرزا بیدل

کی طرز جو ماکیر کے عہد میں شائع ہوئی اور علوی و صہبائی پر آکر ختم

ہو گئی۔ جو لوگ شعر فارسی میں کمال بہم پہنچانا چاہتے تھے، وہ انھیں دونوں میں سے کوئی طرز اختیار کرتے تھے۔ اگرچہ حافظ اور خسرو کی غزل ان سے بہت زیادہ مقبول خاص و عام تھی، مگر ان وجوہات سے جو متاخرین کو طرز جدید اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور جن کا ذکر ہم دوسرے حصے میں کر چکے ہیں، مرزا نے اول بیدل کی روش پر چلنا شروع کیا، پھر اس نظر سے کہ اہل زبان اس طرز کو نکسال سے باہر خیال کرتے تھے، نظیری و عرفی کی طرز اختیار کی۔ ظاہر ہے کہ ایک ہندی نژاد شاعر جو ایسے ناپرساں زمانے میں پیدا ہوا ہو، اور جس نے فارسی شاعری میں نظیری و عرفی وغیرہ کے کلام سے بہتر کوئی ممکن التقليد نمونہ نہ دیکھا ہو، وہ سوا اس کے کہ ان کا اتباع اختیار کرے، اور کیا کر سکتا تھا۔ رہی یہ بات کہ اس نے اس طرز شاعری میں کس قدر کامیابی حاصل کی ہے، اور ان لوگوں کی پیروی کا کہاں تک حق ادا کیا ہے، سو اس کو اس طرح ثابت کرنا تو ناممکن ہے، ایسے دو اور دو چار، البتہ جو لوگ شعر فارسی کا صحیح مذاق رکھتے ہیں، وہ اکبری و کے شعرا اور مرزا کے کلام کا مقابلہ کرنے کے بعد، امید ہے کہ، مرزا کی اعلیٰ درجے کی قابلیت و استعداد کا اعتراف کریں گے اور اس بات کو تسلیم کریں گے کہ زمانہ کا اقتضا اور سوسائٹی کا دباؤ اس شخص کو جس کی روش پر ڈال دیا وہ ضرور اس میں کامیاب ہوتا۔ چنانچہ اخیر عمر میں جب حبیب قآانی کے قصائد مرزا کی نظر سے گزرے، تو اس کے کلام کی روانی اور بے ساختہ پن دیکھ کر ان کو قآانی کی روش پر چلنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ اسی لیے ان کے سب سے پچھلے قصیدوں اور قطعوں میں بہ نسبت پہلے قصائد اور قطعات کے زیادہ روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے لیکن چونکہ

اب دوسری چال چلنے کا وقت نہیں رہا تھا، اس لیے اس روش کی تکمیل ہونی ناممکن تھی۔

اس کتاب میں، جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے، مرزا کو شاعری کے لحاظ سے جا بجا نظیری و عرفی و غیر ہم کا، جن کو مرزا خود اپنا پیش رو تسلیم کرتے ہیں، ہم پتہ قرار دیا گیا ہے۔ سو قطع نظر اس کے کہ کوئی قطعی دلیل اس دعوے پر قائم نہیں ہو سکتی، اور ناظرین کے ذوق و دھیان کے سوا کوئی چیز اس کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ یہاں دو اور سوال پیدا ہوتے ہیں: اول یہ کہ ایک زبان دان آدمی شاعری میں اہل زبان کے برابر ہو بھی سکتا ہے، یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ ایک پیرو اپنے پیشرووں کے ساتھ مسادات کا درجہ حاصل کر سکتا ہے، یا نہیں؟ سو دوسرے سوال کا جواب تو بالکل صاف ہے دنیا میں ابتداء سے آج تک نہ صرف شعرو شاعری میں، بلکہ ہر علم اور ہر فن اور ہر پیشے میں، اکثر پیرو اپنے پیشرووں کے صرف برابر ہی نہیں، بلکہ ان سے فائق اور افضل ہوتے رہے ہیں۔ فردوسی رزمیہ مثنوی میں اسدی اور واقعی کا پیرو ہے، مگر دونوں سے گوے سبقت لے گیا ہے۔ خواجہ حافظ غزل میں سعدی کے قدم بہ قدم چلے ہیں، مگر سعدی سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ قاضی قصیدے میں تمام قدما سے بڑھ گیا ہے۔ میر تقی نے تمام اگلے ریختہ گو یوں کو جو یقیناً اس کے پیشرو تھے، غزل میں اپنے سے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ میر انیس تمام مرثیہ گو یوں سے جو ان سے پہلے ہوئے بازی لے گئے ہیں۔ بس اگر مرزا غالب کو فارسی شاعری میں نظیری و عرفی سے افضل نہیں، بلکہ صرف ان کا ہم پتہ قرار دیا جائے تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے۔

رہا پہلا سوال، سو ظاہر ہے کہ شاعری کا ہنر دو مختلف لیاقتوں سے مرکب ہے۔ ایک امیجینیشن یعنی قوتِ تخیل کی بلند پروازی، دوسرے مناسب الفاظ کے استعمال پر قدرت۔ ان میں سے پہلی لیاقت، جیسا کہ ظاہر ہے، ممکن ہے کہ ایک زبانِ اہل نسبت اہل زبان کے، ایک کم علم بہ نسبت فاضل متبحر کے، اور ایک دیہاتی گنوار بہ نسبت خواص اہل شہر کے، ہر اہل اور اعلیٰ درجے کی رکھتا ہو۔ دوسری لیاقت، اگرچہ بظاہر اہل زبان کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتی ہے، لیکن اس میں بھی مثلاً ایک ہندی نژاد اکتساب کے ذریعے سے خاص کر اس حصہ زبان میں جو فارسی کی محدود شاعری میں مستعمل ہے، اہل ایران کی برابری کر سکتا ہے۔ علامہ ابن خلدون عربی زبان کی نسبت، جو بمقابلہ فارسی کے نہایت وسیع زبان ہے، لکھتے ہیں کہ "ایک عجمی (یعنی غیر عربی)، فصحاء عرب کے کلام کی مارست سے اہل زبان میں شمار ہو سکتا ہے" پس فارسی زبان، جو بہ نسبت عربی کے نہایت تنگ اور مختصر زبان ہے، اس بات کے زیادہ قابل ہے کہ ایک ہندی نژاد فصحاء ایران کے کلام کی مزاوت سے اہل زبان میں شمار کیا جائے۔

مذکورہ بالا اصول کے موافق کچھ شک نہیں کہ ہم اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ مرزا کو ملکہ شاعری کے لحاظ سے اکبری دور کے تمام شاعروں پر ترجیح دیں، یا ان سے کم سمجھیں، یا ان کے برابر قرار دیں۔ رہی دوسری لیاقت، سو اس کی نسبت دوسرے حصے میں مابجا ذکر کیا گیا ہے کہ مرزا نے ایک نہایت مستند صاحب زبان کی تعلیم و تلقین اور اپنے ذاتی تفحص اور کثرت مطالعہ اور غواصی فکر اور مشق سخن اور خاص کر اپنی خداداد لٹریچر

قابلیت سے یقیناً وہ مرتبہ حاصل کر لیا تھا، جس سے ایک زبان دان مثل اہل زبان کے مستند سمجھا جا سکتا ہے۔

لارڈ مکالے نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے پایا جاتا ہے کہ کوئی شخص غیر مادری زبان میں اعلیٰ درجے کا شاعر نہیں ہو سکتا۔ بے شک ان کا ایسا سمجھنا یورپ کی شاعری کے لحاظ سے بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ یورپ کی شاعری درحقیقت نیچر کی ترجمانی ہے، اس کا میدان اسی قدر وسیع ہے، جس قدر نیچر کی فضا۔ اس کے فرائض مادری زبان کے سوا دوسری زبان میں جیسے کہ چاہیں، ادا نہیں ہو سکتے؛ بلکہ ایشیائی شاعر جو اس طریقہ شاعری سے نااہل ہیں وہ اپنی مادری زبان میں بھی اس کی مشکلات سے ہمہ برا نہیں ہو سکتے۔ بخلاف ایشیائی شاعری اور خاص کر متاخرین کی فارسی شاعری کے کہ یہاں انہیں معمولی خیالات کو جو قدما سیدھے سادے طور پر بیان کر گئے ہیں، نئے نئے اسلوبوں اور نئی نئی نزاکتوں کے ساتھ باندھنا یہی کمال شاعری سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی فی نفسہ ایک بہت بڑا کمال ہے، لیکن ایسی شاعری میں زبان کا صرف ایک محدود حصہ مستعمل ہوتا ہے، جس کو غیر زبان والا آسانی سے سیکھ سکتا ہے، اور بشرطیکہ اس میں شاعری کی اعلیٰ قابلیت ہو، اس کو شعراے اہل زبان کی طرح، بلکہ بعض صورتوں میں ان سے بہتر استعمال کر سکتا ہے۔

مرزا کا موازنہ نظیری و عرفی کے ساتھ صرف قصیدے اور غزل میں ہو سکتا ہے کیوں کہ مثنوی میں نظیری محض صفر ہے؛ اس نے اس صنف کو جھوٹا کر نہیں۔ عرفی نے بے شک چند مثنویاں لکھی ہیں، مگر صاحبِ آنشکرہ نے ان میں سے ایک کی نسبت لکھا ہے کہ ”بدگفتہ است“ اور باقی

کی نسبت اس کا یہ قول ہے کہ "بسیار بدگفتہ و حکیم ہمام کا بیٹا حکیم حاذق" عرفی کی مثنوی کی نسبت کہتا ہے :

مثنوی طرز فصاحت نہ داشت کان شک بود و ملاححت نہ داشت

البتہ ظہوری کے ساقی نامہ نے ہندوستان میں بہت شہرت حاصل کی ہے۔ مگر اس کا قصیدہ چنداں وزن نہیں رکھتا، بخلاف مرزا کے کہ اس کو مثنوی پر بھی تقریباً اسی قدر قدرت ہے، جیسی قصیدے اور غزل پر۔ نثر میں نظیری عرفی دونوں نے کوئی یادگار نہیں چھوڑی۔ البتہ ظہوری کی سہ نثر کو ہندوستان میں بہت فروغ ہوا ہے، مگر اس میں اول سے آخر تک ایک بے مزہ کہانی یعنی ابراہیم علول شاہ کی مدح و ستائش کے سوا دوسرے مضمون کا نام نہیں، جس سے لکھنے والے کی قدرت بیان معلوم ہو۔ پس اگر ظہوری کی طرز بیان اول اور طرز عبارت آرائی کے حسن و قبح سے قطع نظر کی جائے، تو بھی اس کے حق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کو مدحیہ نثر لکھنی اچھی آتی تھی، بخلاف مرزا کے کہ وہ اپنی طرز خاص میں ہر طرح کے مضامین لکھنے اور ہر طرح کے مقاصد ادا کرنے پر یکساں قدرت رکھتا تھا خصوصاً فخر و خود ستائی، غم و اندوہ، اور شکایت و زاری کے مضامین جس خوبی و لطافت اور بانگدہن کے ساتھ مرزا نے نثر میں بیان کیے ہیں، اس کی نظیر نہ صرف ہندوستان کی نثر میں بلکہ متاخرین اہل ایران کی نثر میں مشکل سے دستیاب ہوگی۔ مگر افسوس ہے کہ ہم یہ باتیں ایسے زمانے میں لکھ رہے ہیں کہ گو ہر شخص آزادی سے اپنی رائے ظاہر کر سکتا ہے، لیکن فارسی زبان ہمارے ملک میں بمنزلہ مردہ زبان کے ہو گئی ہے، اور اس لیے لوگوں سے اپنے دعوے کے ثبوت میں اس کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ دیکھو، پرہو، سمجھو۔

اور جانچو۔

الغرض مرزا کی فارسی نظم و نثر کے متعلق ہماری رائے کا ماحصل یہ ہے کہ ان کا مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عرفی اور نظیری کے لگ بھگ اور ظہوری سے بڑھا ہوا؛ مثنوی میں ظہوری کے لگ بھگ اور عرفی و نظیری سے بالا اور نثر میں تینوں سے بالاتر ہے۔ اگرچہ مرزا کی غزل میں کہیں کہیں پیچیدگیاں ہیں، اور نثر میں بھی اکثر فقرے نہایت پیچیدہ نظر آتے ہیں، جو ممکن ہے کہ اہل زبان کے نزدیک فصاحت کے درجے سے گرسے ہوئے ہوں، مگر ایسی کسروں سے کسی زبان دان یا اہل زبان کا کلام پاک نہیں ہو سکتا اور نہ ایسی جزدی فروگزاشتوں سے کسی کی اسادی میں فرق آ سکتا ہے و بشہ ذہن القائل:

گر سخن امجاز باشد بے بند و پست نیست درید ریضا ہمہ انگشت ہایک دست نیست
مرزا کے اردو کلام کی نسبت ہم دوسرے حصے میں بقدر ضرورت بحث کر چکے ہیں۔ مرزا کا موازنہ شعرا سے اردو زبان کے ساتھ صرف غزل میں ہو سکتا ہے کیوں کہ غزل کے سوا دیگر اصناف میں ان کا کلام کان لم یکن ہے۔ اور اردو کی نثر میں دیگر شعرا بمقابلہ مرزا کے صفر محض ہیں۔ مرزا کی غزل کا ہمنگ اگرچہ قیرو و سودا کی روش پر نہیں ہے، مگر خواص اہل ملک جو عقیدہ کی تید سے آزاد ہیں، ان کے چیدہ و برگزیدہ اشعار کو میر و سودا کے انتخاب سے کچھ کم پسند نہیں کرتے۔

مرزا کی نثر اردو نے تمام ہندوستان میں شہرت حاصل کی ہے اور خاص و عام نے بالاتفاق اس کو پسند کیا ہے۔ انھوں نے اردو خط و کتابت میں ایک خاص طرز کی ایجاد کی ہے جو تمام ملک میں مقبول ہوئی ہے اور اکثر

لوگوں نے اپنی بساط کے موافق اس کی پیروی کی ہے۔
 ان تمام باتوں پر نظر کرنے کے بعد مرزا کی نسبت یہ کہنا کچھ مبالغ نہیں معلوم
 ہوتا کہ لٹریچر کی قابلیت کے لحاظ سے مرزا جیسا جامع حیثیات آدمی امیر خسرو
 اور فیضی کے بعد آج تک ہندوستان کی خاک سے نہیں اٹھا۔ اور چوں کہ
 زمانے کا رخ بدلا ہوا ہے اس لیے آئندہ بھی یہ امید نہیں ہے کہ قدیم طرز کی
 شاعری و انشا پردازی میں ایسے باکمال لوگ اس سرزمین پر پیدا ہوں گے۔

عربوں میں تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقاء

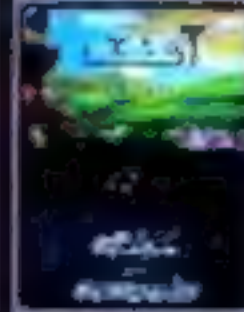


مصنف: محمود الحسن

صفحات: 224

قیمت: 80/- روپے

آبجکٹ



مصنف: اسرار الحق مجاز

صفحات: 240

قیمت: 84/- روپے

رسول اکرمؐ اور یہود حجاز



مصنف: سید برکات احمد

مترجم: مشیر الحق

صفحات: 208

قیمت: 76/- روپے

جدید اردو ادب



مصنف: محمد حسن

صفحات: 256

قیمت: 87/- روپے

پت جھڑکی آواز



مصنف: قمر العین حیدر

صفحات: 352

قیمت: 110/- روپے

اقبال کا نظریہ خودی



مصنف: عبدالمغنی

صفحات: 544

قیمت: 155/- روپے

حیات سعدی



مصنف: خواجہ الطاف حسین حالی

صفحات: 256

قیمت: 72/- روپے

خواجہ انور



مصنف: خواجہ میر درد دہلوی

صفحات: 172

قیمت: 57/- روپے

₹ 112/-

ISBN : 978-81-7587-681-1



9 788175 876811